نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی ۳ روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بوجۂ اضافۂ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینے کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنے ۸ر کے ٹکٹ وصول ہونے پر — منیجر "نگار"

جلد ۳۸	فہرست مضامین نومبر ۱۹۴۰ء	شمارہ ۵

ملاحظات		۴
اُردو صحافت	قاضی عبدالغفار اڈیٹر پیام	۹
لکھ داتا	شیر محمد اختر	۲۳
اُس لڑائی کے بعد اور اس لڑائی سے پہلے		۲۶
نگار کا نظیر نمبر	مجنوں گورکھپوری	۳۴
خان آرزو ایک نقاد کی حیثیت سے	اقبال حسین	۴۱
دُنیا کی سب سے بڑی دوربین		۵۰
تاریخ صحف سماوی		۵۵
مکتوبات نیاز		۶۰
باب المراسلۃ والمناظرہ		۶۳
باب الاستفسار		۶۹
نانا میاں کی موٹر	مرزا ظفر الحسن بی۔ اے (عثمانیہ)	۷۳
منظومات	عدم - ماہر القادری	۷۷

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

شمارہ ۵	نومبر سنہ ۴۸ء	جلد ۲۸

جنوری سنہ ۴۹ء کا "نگار"

چونکہ بہت زیادہ ضخیم ہوگا اس لئے فروری سنہ ۴۹ء کی اشاعت بھی اسی میں شامل کردیگئی ہے۔ جن حضرات کا چندہ جنوری سنہ ۴۸ء میں ختم ہوتا ہے (اور جن کے نام فروری کا پرچہ ذریعہ وی۔پی بھیجا جاتا) ان کو بھی اپنا چندہ اخیر دسمبر تک بھیجدینا چاہئے ورنہ جنوری کا پرچہ ان کے نام بھی ذریعہ وی روانہ کیا جائے گا۔

چونکہ جنوری کے پرچہ کی روانگی ۲ر جنوری سے شروع ہوجائے گی اس لئے جو صاحب ذریعہ منی آرڈر چندہ بھیجنا چاہیں ان کو چاہئے کہ اخیر دسمبر تک چندہ بھیجدیں۔

ایک اور بات

یہ ہے کہ جن طلبہ یا لائبریریوں سے رعایتی چندہ لیا جاتا ہے، وہ جنوری نمبر کے لئے آٹھ آنے

زیادہ ادا کریں گے۔ اس لئے انھیں چاہئے کہ منی آرڈر میں آٹھ آنے کا اضافہ کردیں، ورنہ ہم وی۔پی میں یہ رقم بڑھا دیں گے۔ کاغذ کی گرانی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ رعایتی چندہ میں جنوری کا پرچہ بھی شامل کیا جائے جس کی ضخامت تقریباً تین اشاعتوں کے برابر ہو

یہ بھی خیال رکھئے

کہ آیندہ کسی ششماہی خریداری میں جنوری کا پرچہ شامل نہ ہوگا اس لئے ششماہی خریداروں کو اپنی ۶ ماہ کی مدت ایسی مقرر کرنا چاہئے کہ اس میں جنوری کا مہینہ شامل نہ ہو۔

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء کے نگار کی اہمیت

کا صحیح اندازہ آپ ابھی نہیں کر سکتے، جس وقت وہ آپ کی نگاہ سے گزرے گا، اسوقت آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ کسقدر دلچسپ، الکسدرجہ مفید اور کتنا اہم تذکرہ ہے ـــ اکابر شعراء کا ایسا کلام فراہم کرنا جو خود انھوں نے انتخاب کیا ہو۔ ان کے وہ حالات پیش کرنا جو خود انھوں نے لکھے ہوں، دُنیائے تذکرہ میں بالکل نئی چیز ہے جسکی قدر و قیمت زمانہ کے ساتھ بڑھتی جائے گی اور ہر اُس شخص کے لئے جو موجودہ دور کی شاعری پر صحیح تبصرہ کرنا چاہتا ہے اس کے لئے اس مجموعہ کا مطالعہ ناگزیر ہوگا ـــ کوشش کی گئی ہے کہ ایک مخصوص معیار کے تمام شعراء کا کلام اس مجموعہ میں نظر آئے اور اسوقت تک تقریباً ایسے تمام اساتذہ کا کلام موصول ہو چکا ہے۔ اُردو غزلگوئی پر بھی ایک نہایت بسیط مقالہ شایع کیا جائے گا جو بجائے خود ایک مستقل رسالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

بہر حال اس مجموعہ کو ہم ہر حیثیت سے ایک مفید و مکمل تالیف کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس سلسلہ میں

ایک فرض آپ کا بھی ہے

وہ یہ کہ آپ خود بھی نگار کی خریداری کو جاری رکھیں اور اپنے حلقۂ احباب میں بھی اسکی توسیع اشاعت کی طرف توجہ فرمائیں، کیونکہ پھر یہ سالنامہ کسی قیمت میں بھی نہ مل سکیگا، ہم اسکی زاید کاپیاں طبع کرا رہے ہیں لیکن ان کی تعداد اتنی نہیں ہے کہ دو تین مہینے سے زیادہ کے لئے کافی ہو۔

ایجنٹوں کو بھی: یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ جتنا آرڈر دے سکتے ہیں، ابھی سے نوٹ کرا دیں، ورنہ ہم دوبارہ اُنکے آرڈر کی تعمیل نہ کر سکیں گے ـــ اس سالنامے کی قیمت دو روپیہ فی کاپی ہے اور کمیشن حسب معمول وہی پچیس فی صدی دیا جائے گا ـــ اس وقت زاید کاپیاں منگا کر رکھ لینا، ایسا سودا ہے جس کے فایدہ کا حال ابھی نہیں دو چار مہینے گزرنے کے بعد معلوم ہوگا۔

منیجر نگار

ملاحظات

رفتارِ جنگ

آج ۳۰ر اکتوبر ہے اور اب میں بالکل مجبور ہوں کہ واقعات آیندہ کا انتظار کئے بغیر، رفتارِ جنگ پر تبصرہ کروں، میں نے خیال کیا تھا کہ شاید اخیر اکتوبر تک جنگ کی موجودہ نوعیت کوئی ایسی صورت اختیار کرے گی جو رائے زنی میں زیادہ دلچسپی پیدا کر سکے، لیکن یہ توقع حسب دلخواہ پوری نہ ہوئی اور اب انتظار کا زیادہ موقع نہیں

اگر اکتوبر کے ملاحظات نگاہ سے گزرے ہوں گے تو آپ کو خیال ہوگا کہ میں نے یونان اور اٹلی کے جنگ کی پیشین گوئی کر دی تھی اور اس میں شک نہیں کہ جن حالات و واقعات کے تحت، یہ لڑائی شروع ہوئی ہے، وہ غیر معمولی خطرات کی خبر دے رہے ہیں اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ جنگ تمہید ہے کسی اور حقیقی جنگ کی جو غالباً غرب سے شرق تک پھیل جانے والی ہے

فتح فرانس کے بعد ہٹلر نے طے کر لیا تھا کہ وہ انگلستان پر حملہ کرے گا اور اسے یقین تھا کہ فرانس کی طرح وہ برطانوی حکومت کو بھی آسانی سے زیر کر لیگا، چنانچہ اس نے پہلے سواحل انگلستان پر اور پھر قلب انگلستان پر اسی ارادے سے ہوائی حملے شروع کر دئے لیکن جب وسطِ اکتوبر تک اسے مسلسل ناکامیاں ہوئیں تو اسے تشویش پیدا ہوئی کہ وہ اپنی ان ناکامیوں کی کیا تاویل کرے اور اپنی مسلح فوجوں کو جو لاکھوں کی تعداد میں حملۂ انگلستان کے لئے طیار کی گئی تھی کہاں لے جائے اور موجودہ حالات ہٹلر کی اسی تشویش و کاوش کا نتیجہ ہیں

ہٹلر کو اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ انگلستان کی زبردست بحری قوت اس کی راہ میں بڑی سخت روک ہے اور جب تک بحرِ روم پر انگریزوں کا اقتدار قایم ہے وہ کچھ نہیں کر سکتا، چنانچہ اس سلسلہ میں قدرتاً سب سے پہلے اسکی نگاہ جبرالٹر اور نہر سویز پر پڑی اور اب اس کی انتہائی کوشش یہی ہے کہ یہ دونوں مقامات برطانیہ سے چھین لے۔

اس نے اس کوشش میں سب سے پہلے دو چالیں اختیار کیں، ایک طرف اس نے اسپین سے گفتگو شروع کی اور دوسری طرف رومانیا پر اقتدار حاصل کر کے بحر اسود اور بحر ایجین کی طرف سے دباؤ ڈالنے کی تدابیر اختیار کی، لیکن جب اسپین میں اسکو کامیابی زیادہ آسان معلوم نہ ہوئی اور جنرل فرانکو نے شرکتِ جنگ سے معذوری ظاہر کی،

توہٹلر کی بے چینیاں اور بڑھیں اور اس نے خود فرانکو، مسولینی اور مارشل پیٹان سے ملکر جنگ کی وہ فضا پیدا کردی جو یقیناً ہٹلر کی مایوسیوں کو بڑی حد تک کم کر دینے والی ہے۔

ابھی تک اس کی تحقیق نہیں ہوسکی کہ اسپین، جرمنی کے ساتھ جنگ میں شریک ہوگا یا نہیں، لیکن فرانس کی حکومت سے جو گفتگو ہو رہی ہے اور جس کی تفصیلات اخباروں میں آچکی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسپین نے بعض شرایط کے ساتھ شرکت کا ارادہ کرلیا ہے اور ان شرطوں میں غالباً بڑی شرط یہ ہے کہ مراکش کا شمالی حصہ اسپین کو دیدیا جائے

مسولینی اور ہٹلر کے درمیان جو گفتگو حال ہی میں ہوئی ہے اس کے متعلق اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہر نوع ان دونوں کے لئے نہایت اطمینان بخش ہے اور اس اطمینان کے معنے یہی ہوسکتے ہیں کہ آیندہ نوچ کھسوٹ کے متعلق ان دونوں نے ایک اسکیم مرتب کرلی ہے اور یونان پر حملہ کرنا اس اسکیم کی تکمیل کی طرف پہلا قدم اُٹھانا ہے

جنگ کی اس جدید فضا میں ہٹلر زیادہ تر فرانس کی کمزوری سے فایدہ اُٹھانا چاہتا ہے اور جو مطالبات اس نے پیش کئے ہیں وہ اگر مارشل پیٹان کی وزارت نے مان لئے تو یقیناً جنگ کا رخ بہت کچھ بدل جائے گا اور جاڑوں میں لڑائی کی چہل پہل شاید گرمی سے زیادہ رہے

۲۹ر کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ فرانس کی وزارت نے رضامندی ظاہر کردی ہے کہ:

۱- الساس لورین کا علاقہ جرمنی کے حوالے کر دیا جائے

۲- فرانسیسی مقبوضات کے تمام ہوائی اور بحری مرکز دوران جنگ میں ہٹلر اور مسولینی کے اختیار میں دیدئے جائیں

۳- انڈوچائنا کا علاقہ جاپان کو مل جائے

۴- مراکش کا بڑا حصہ اسپین کو دیدیا جائے

۵- تیونس اور الجیریا کا ایک حصہ اٹلی کے حوالہ کر دیا جائے، اور

۶- فرانسیسی نوآبادیوں پر فرانس، اٹلی اور جرمنی تینوں ملکر حکومت کریں۔ اسی کے ساتھ فرانس کو اس بات پر بھی مجبور کیا گیا ہے کہ وہ سیاسی و اقتصادی حیثیت سے نازی سیادت کو تسلیم کرتے ہوئے برطانیہ کے خلاف یوروپ میں جدید نظام سیاست کی بنیاد قایم کرے اور جو بحری قوت اس کی بچ رہی ہے وہ بھی برطانیہ کے خلاف استعمال کرنیکے لئے ہٹلر کے حوالے کر دے

ہر چند ابھی تک پوری طرح اس کی تصدیق نہیں ہوئی، لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ کم و بیش انھیں شرایط پر

فرانس کو رضامندی ظاہر کرنا پڑے گی اور جو نتائج اس سے ظاہر ہوں گے ان کی اہمیت ظاہر ہے۔

پچھلے مہینے، جاپان، اٹلی اور جرمنی کا اتحاد اور اس مہینے فرانس سے یہ سمجھوتا جو نہ صرف اسپین بلکہ تقریباً تمام شمالی اور مغربی افریقہ کو ہٹلر کے زیر اثر لاکر، بحر روم میں برطانیہ کے لئے غیر معمولی خطرات پیدا کر دینے والا ہے، کوئی معمولی بات نہیں۔ وسط یوروپ اور بلقان میں جس طرح آہستہ آہستہ نازی اقتدار بڑھ رہا ہے اور رومانیا کے ساتھ ساتھ بلغاریا اور یگوسلیویا کو بھی ہٹلر جس طرح اپنے اثر میں لے آیا ہے، اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ ایک طرف رومانیا نے بہت سے برطانوی تجارتی جہاز جو بحر اسود میں پائے جاتے تھے ضبط کر لئے اور دوسری طرف یونان کے اندر اٹلی کی فوجوں کے اقدام پر نہ بلغاریا نے کوئی اعتراض کیا نہ یگوسلیویا نے

ترکی، جس کو بر بنائے معاہدۂ اتحاد، یونان کی مدد کرنا چاہئے تھی، وہ بھی روس کی خاموشی کی وجہ سے خاموش ہے لیکن اس کی یہ خاموشی کب تک قایم رہ سکتی ہے، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا

ہٹلر، جو دوستی کی پرواہ میں "دوست کشی" کا عادی ہے، اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ترکی کو مٹانے کے لئے بھی ہر وقت طیار ہے اور اگر یونان فتح ہوگیا تو پھر موصل و عراق کی طرف بڑھنے کے لئے وہ ترکی سے لڑ بیٹھنے کے لئے بھی وہی بہانے تلاش کرلیگا جو اٹلی نے یونان کے مقابلہ میں اختیار کئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اسوقت اسٹالین کا چہرہ جس پر ترکی کی دوستی کا نقاب پڑا ہوا ہے، ہمیشہ کے لئے کھل جائے

جاپان کا روس کی طرف مصالحت کا میلان، اور چین کے جھگڑوں سے فارغ ہونے کی کوشش کرنا اور اسی کے ساتھ انڈوچائنا کے سمندر میں ہوائی اور بحری مرکز قایم کرلینا، ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ مشرق سے لیکر مغرب تک ڈکٹیٹروں نے ایک جال بچھا رکھا ہے جسے جمہوریت پسند حکومتوں کے چاروں طرف تنگ کرتے جا رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اسوقت تنہا برطانیہ ان تمام مخالف قوتوں کا مقابلہ کر رہا ہے اور صرف امریکہ ہی ایک ایسا ملک ہے جس سے بہت کچھ توقعات اس کی وابستہ ہیں، لیکن وہاں بھی فی الحال روزولٹ کے سہ بارہ انتخاب کا جھگڑا پڑا ہوا ہے اور اگر روزولٹ کی جگہ مسٹر ولکی صدر منتخب ہوگیا، تو پھر ہو سکتا ہے کہ ان توقعات کی نوعیت بدل جائے، لیکن چونکہ خود امریکہ کی پبلک کا میلان برطانیہ کی طرف زیادہ ہے اس لئے امریکہ کی موجودہ پالیسی میں کسی تغیر کا امکان بہت ضعیف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اخیر اکتوبر سے لڑائی کا رنگ بہت کچھ بدلگیا ہے اور ہٹلر کی یہ پالیسی کہ برطانوی حکومت کے خلاف ایک سے زاید محاذ قایم کئے جائیں ایک حد تک بار آور ہوتی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کا یقین ہٹلر کو بھی نہیں کہ بحر روم میں برطانیہ کی بحری قوت اور مصر و فلسطین میں اس کی بری قوت کو ان ترکیبوں سے توڑا جا سکتا ہے

برطانیہ، یونان کی مدد کے لئے ہر طرح طیار ہے اور یونان نے بھی اخیر وقت تک مقابلہ کا عزم کرلیا ہے

اس لئے اٹلی کا اس مہم کو سر کر لینا آسان نہیں۔ ہٹلر نے دھمکی دی ہے کہ اگر برطانیہ نے یونان کی مدد کی تو وہ بھی اٹلی کی مدد کرے گا، لیکن یہ صرف دھمکی ہی دھمکی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یونان کی جنگ کا فیصلہ بھی پانی ہی پر ہوگا اور پانی سے ہٹلر و مسولینی دونوں جتنا ڈرتے ہیں ظاہر ہے

اٹلی کا مطالبہ ہے کہ مقدونیا کا علاقہ اور ساحل یونان کے دو جزیرے کورفو اور کریٹ اسے ملنا چاہئے، لیکن اس مطالبہ کا پورا ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے کیونکہ مقدونیا کی حوالگی کو ترکی کسی طرح گوارا نہ کرے گا اور کریٹ وغیرہ کی واپسی براہ راست برطانوی مفاد کے خلاف ہے۔ اس لئے اگر اٹلی نے اس پر اصرار کیا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اُسے ایک طرف ترکی کی فوجوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور دوسری طرف اُن برطانوی بیڑوں کا، جو بحر روم میں سواحل یونان کے پاس ہی موجود ہیں اور جن کے خوف سے اسوقت تک سرزمین افریقہ میں کسی قابلِ ذکر اقدام کی جرأت اٹلی نے نہیں کی

اس کے علاوہ اندرونی طور پر ایک اُلجھن اور اٹلی کے لئے پیدا ہونے والی ہے جو البانیہ سے متعلق ہے۔ البانیہ پر جس طرح اٹلی نے قبضہ کیا ہے اس کی حقیقت سب کو معلوم ہے۔ وہاں کی آبادی اپنی کھوئی ہوئی آزادی حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہاں انقلاب کی لہر دوڑ جائے اور جس طرح چین والوں نے چھاپے مار مار کر جاپان کو پریشان کر رکھا ہے اسی طرح یہاں کی آبادی بھی اٹلی کے لئے اس رہگزر کو دشوار بنا دے

اس میں شک نہیں کہ ہٹلر نے رومانیا پر قبضہ کرکے بلغاریا اور یوگوسلیویا دونوں کو دبا لیا ہے، جو اٹلی کے خلاف کسی طرح یونان کی مدد کی جرأت نہیں کر سکتے، لیکن سوال یہ ہے کہ بحر اسود پر جرمنی کے اس اقتدار کو روس گوارا کرے گا یا نہیں۔ روس اس کو گوارا کر سکتا ہے کہ جرمنی رومانیا کے پٹرول سے فایدہ اُٹھائے، وہاں کی خام پیداوار کو کام میں لائے، لیکن وہ یہ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا کہ بحر اسود، جرمنی کے بحری اور ہوائی بیڑوں کا مرکز بن جائے۔ دُنیائے سیاست میں دوستی و دشمنی کا معیار کوئی اخلاقی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس کا تعلق صرف دُنیاوی اغراض سے ہوتا ہے، اگر روس نے اسوقت تک جرمنی کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھایا تو اس کے معنے یہ نہیں کہ وہ جرمنی کا دوست ہے بلکہ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ فی الحال وہ اپنا فایدہ اسی میں دیکھتا ہے، لیکن اگر کسی وقت اس نے یہ دیکھا کہ فایدہ رشتۂ دوستی توڑ دینے ہی میں ہے تو پھر وہ فوراً اس کے لئے بھی طیار ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ہٹلر نے اسٹالین کو مشرقی ممالک کی لالچ میں مبتلا کر رکھا ہو اور اندرونی طور پر کوئی معاہدہ ایسا ہو گیا ہو جس کی رُو سے روس کو اپنی خاموشی کی قیمت معقول ملنے کی توقع پیدا ہو گئی ہو، لیکن اسٹالین اس حقیقت کو کبھی نہیں بھول سکتا کہ نازیت کا ہر کامیاب قدم اشتراکیت کی موت ہے اور وہ کبھی اُن حدود سے آگے اُسے بڑھنے نہ دے گا جن سے گزر جانے کے بعد سوویٹ نظام کا کچل دینا اس کے لئے آسان ہو جائے۔

اسٹالین، نہایت خاموشی کے ساتھ حالات کا مطالعہ کر رہا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کا فایدہ زیادہ تر جرمنی کی شکست ہی سے متعلق ہے، لیکن وہ خود اس میں دخل دینا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ اسے یقین ہے کہ دُنیا میں ہٹلر ختم ہو یا نہ ہو لیکن ہٹلریت کو ایک دن ضرور ختم ہونا ہے، اور یہی اس کا عین مقصود ہے۔

کلام الٰہی کا حقیقی مفہوم

کلام مجید کے متعلق جو بحثیں بعض رسایل میں جاری ہیں، وہ اپنی جگہ خواہ کتنی ہی مفید کیوں نہ ہوں، لیکن ان میں سے کوئی ایسی نہیں جو اصل سوال سے متعلق ہو یا مجھ پر غلط الزامات قایم کرنے والی نہ ہو۔ مجھے رسول اللہ کی رسالت سے انکار نہیں، ان کی عظمت وصداقت سے انکار نہیں، لیکن گفتگو صرف اس بات میں ہے کہ قرآن مجید کو "خدا کا کلام" کہنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اگر رسول اللہ نے قرآن کو خدا کا کلام کہا تو کیا اس کے معنے یہ ہیں کہ جو الفاظ اس میں پائے جاتے ہیں انکے الفاظ انسانی ہونے سے بھی انھوں نے انکار کیا۔ پھر اگر قرآن مجید کے الفاظ، انسانی زبان کے ہیں تو ظاہر ہے کہ کلام الٰہی سے مراد کچھ اور ہوگی اور وہی میں معلوم کرنا چاہتا ہوں

میرے نزدیک الہام ووحی کا تعلق ایک خاص وجدانی کیفیت سے ہے جو فطری ودیعت کی بنا پر ہر شخص میں پائی جاتی ہے اور جس کا ثبوت خود کلام اللہ سے بھی ملتا ہے۔ لیکن چونکہ رسول اللہ کی ذات گرامی میں یہ فطری ودیعت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی اور اصلاحِ اخلاق کا جذبہ ان میں بہت شدید تھا، اس لئے الفاظ رشد وہدایت بے اختیار ان کی زبان سے نکل جاتے تھے

رہا یہ امر کہ ان الفاظ کو کلام الٰہی سے کیوں تعبیر کیا گیا، سو اس کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ رسول اللہ نے جو کچھ فرمایا وہ وہی تھا جو خدا نے اُن سے کہلوایا اور اس صورت میں اگر ہم فرمودۂ رسول کو فرمودۂ خدا کہیں تو کیا غلطی ہے

بعض حضرات نے خدا کے سمیع وبصیر ہونے سے قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر استدلال کیا ہے، حالانکہ اس دلیل سے وہ خود اپنی تردید کرتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح خدا کے ساتھ سننے اور دیکھنے کی نسبت کوئی مادی کیفیت نہیں رکھتی اسی طرح کلام کی حیثیت بھی مادی نہ ہونا چاہئے۔ اگر خدا بغیر الفاظ کی مدد کے سُن سکتا ہے تو بغیر الفاظ کی مدد کے وہ بول بھی سکتا ہے اور یہ بولنا ویسا ہی ہوگا جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، یعنی ایک وجدانی کیفیت پیدا کر کے بے اختیارانہ طور پر کسی کی زبان سے کچھ کہلوا دینا۔ اسلئے براہ کرم پہلے کلام کی حقیقت پر بحث کیجئے، اسکے بعد کلام الٰہی کے متعلق اپنے عقاید کو سامنے رکھکر دیکھئے کہ میں کیا کہتا ہوں اور آپ کیا جواب دیتے ہیں۔ صرف مجھے بُرا بھلا کہکر اور میری ذاتیات سے بحث کر کے کسی علمی یا مذہبی مسئلہ کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ میں جاہل سہی، لیکن اور سب لوگ تو جاہل نہیں جنکے دل میں یہ خطرات پیدا ہوتے ہیں، پھر کیا مجھے جاہل کہدینا ان سب کو مطمئن کر سکتا ہے۔ کاش یہ حضرات سمجھ سکتے کہ اسی ذہنیت کا دوسرا نام (Inferiority Complex) ہے جسے وہ خود اپنی تحریروں سے ہمیشہ کے لئے ثبت کرتے جاتے ہیں!

اُردو صحافت

مشرقی ممالک کی زندگی کے اقتصادی سیاسی اور وہ تمدنی انقلابات جو (۱۹ ویں) صدی عیسوی کے نصف اول میں شروع ہوئے ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد ہماری اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ پر چھا گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مشرق کی قدیم ذہنیت نے اُستاد مغرب کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور اس ملک کی قدیم تہذیب، جدید تہذیب سے ٹکرائی اور ٹکرا کر اس بُری طرح پسپا ہوئی کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا مشرق کی آنکھوں کو مغرب کی روشنی نے گھیر لیا۔

مغرب ہمارے لئے بہت سے مفید تحفے لایا مگر بہت سی خرابیاں بھی لایا وہ جو اچھی چیزیں لایا اُن میں سے پھولوں کے ساتھ کہیں کہیں کانٹے بھی تھے، بہر حال اس ذہنی انقلاب کی موجوں میں جدید وسایل رسل و رسایل اور اشاعتِ اخبار کی ایک قوت بھی تھی جس نے زمین کے طنابیں کھینچ دیں اور ذہنی وسعت کی راہیں کھول دیں۔

جدید صحافت ہمارے لئے ایک غیر ملکی تحفہ تھا اس لئے اس سے پہلے شاہی درباروں کی پرچہ نویسی اور وقایع نگاری کے سوا خبر رسانی کا اور کوئی منظم ذریعہ اس ملک میں موجود نہ تھا

۱۷ ویں صدی عیسوی کے آغاز میں یورپ کی اخبار نویسی یورپین زندگی کا ایک نمایاں عنصر بن چکی تھی انگلستان میں بھی چارلس اول کے قتل اور حکومت کے انقلاب کے بعد اُس قومی صحافت نے اپنا جھنڈا بلند کیا تھا جس کی نسبت بعد کو نپولین جیسا شخص کہا کرتا تھا کہ ”چار مخالف اخبار ایک ہزار سنگینوں سے زیادہ خطرناک ہیں“

لیکن ہندوستان میں صحافت کا چرچا ۱۸ ویں صدی کے آخر میں شروع ہوا اور غالباً پہلا انگریزی اخبار سنہ ۱۷۸۰ء میں کلکتہ سے جاری ہوا اس واقعہ کے تقریباً (۴۲) سال بعد اُردو زبان کا پہلا اخبار شایع ہوا۔

یعنی ہمارے ملک کی اُردو صحافت یورپ سے تقریباً دو سو برس پیچھے چل رہی ہے لیکن اس پسماندہ اُردو صحافت کی داستان بھی اب کم و بیش ایک صدی کی بہت دلچسپ داستان ہے، ان تقریروں میں اس میدان کا صرف ایک گوشہ سُننے والوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

اُردو صحافت کی یہ داستان بہت منتشر حالت میں ہے سوائے دو تین مختصر کتابوں اور چند مضامین کے کوئی لٹریچر ایسا موجود نہیں ہے جو اس کی تاریخ کے مطالعہ میں مدد دے سکے، سید محمد اشرف معتمد انجمن علمی لکھنؤ کی مرتبہ صرف ایک کتاب

اخترِ شہنشاہی ہے جو ۱۸۱۸ء میں شایع ہوئی تھی اس کتاب کے نسخے اب کمیاب ہیں، اس کے علاوہ ۱۹۱۹ء میں پیسہ اخبار لاہور کے دفتر سے "اخبار نویسوں کے حالات" شایع ہوئے یہ کتاب نامکمل ہے تاہم غنیمت ہے ان دو کتابوں کے علاوہ اُردو زبان کی صحافت کے متعلق مزید معلومات کا زیادہ قابلِ اعتماد ذریعہ گارساں دی تاسی کے وہ مضامین ہیں جن کا ترجمہ انجمن ترقی اُردو کے رسالہ اُردو میں شایع ہو چکا ہے، مزید برآں فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور قدیم دہلی مدرسہ کے حالات میں بھی جو شایع ہو چکے ہیں اُردو صحافت کے ابتدائی دور کے متعلق کچھ معلومات ملتی ہیں اگر اس کے سوا بھی کچھ قابلِ اعتماد لٹریچر موجود ہے تو مجھے معلوم نہیں۔

معلومات کے اس ذخیرہ کی حد تک جو میں جمع کر سکا ہوں میں نے اُردو صحافت کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنے دورِ اول جو سب سے زیادہ دلچسپ ہے ۱۸۵۸ء میں ختم ہوتا ہے، پھر دوسرا دور ۱۸۸۸ء میں ختم ہوتا ہے اور تیسرا دور ۱۸۸۸ء سے شروع ہو کر ۱۸۹۹ء میں ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد کا دور اُردو صحافت کا دورِ جدید ہے۔

جہاں تک میری رسائی ہو سکی ہے اُردو زبان کا پہلا مطبع (غالباً ٹائپ) ۱۸۱۰ء میں بمقام کلکتہ قایم ہوا، اس پریس کا نام ہندوستانی پریس تھا اور اس کے مالک کوئی اکرام علی صاحب تھے اُردو کا پہلا اخبار خیر خواہ ہند کے نام سے ۱۸۳۷ء میں بنارس سے جاری ہوا یہ اخبار ٹائپ میں چھاپا جاتا تھا اور اُس کے مالک پادری شرمن صاحب تھے یہ پرچہ شایع تو بنارس سے ہوتا تھا مگر طبع ہوتا تھا کلکتہ کے بیپٹسٹ مشن پریس میں یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ اُردو صحافت کے ابتدائی ترقی میں نمایاں حصہ عیسائی مبلغین کا ہے، جنھوں نے زیادہ تر اپنے تبلیغی اغراض کے لئے اُردو زبان میں صحیفہ نگاری شروع کی تھی اُس زمانہ کی صحافت کا ایک دوسرا پہلو جو بہت نمایاں رہا یہ تھا کہ اُردو زبان کے بہت سے رسایل و جرائد ہندو اڈیٹروں کے زیرِ ادارت شایع ہوا کرتے تھے اور اس قدیم صحافتی لٹریچر میں بہت بڑا حصہ ہندو اہلِ قلم کی جد و جہد کا تھا۔

۱۸۵۷ء سے چند سال پہلے ہندوستان کے ہر صوبہ میں اُردو زبان کی صحافت نمایاں ہونے لگی تھی، چنانچہ دہلی میں سب سے پہلا اُردو پریس ۱۸۴۵ء میں قایم ہوا، جس کا نام دار السلام تھا اس کے مالک مولوی عنایت حسین تھے۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہونے تک آخری تاجدارِ مغلیہ کے دربار کا روزنامچہ بھی اُردو اخبار کے نام سے جاری رہا، مرزا غالب نے اُردوئے معلیٰ میں جا بجا اس کا تذکرہ کیا ہے اور خواجہ حسن نظامی صاحب بھی اس کے بہت سے اقتباسات شایع کر چکے ہیں۔

یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ غدر سے (۵) سال پہلے ۱۸۵۲ء میں ایک ہندو ریاست گوالیار میں سب سے پہلے سرکاری گزٹ اُردو زبان میں شایع ہونا شروع ہوا اس زمانہ کے تقریباً چار سو جراید و رسایل کی ایک دلچسپ فہرست میں اس وقت تک مرتب کر سکا ہوں۔

بہت ہی اختصار کے ساتھ داستان یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ ۱۸۴۲ء میں لکھنؤ سے ایک مذہبی پرچہ جس کا

نام "جلالی" تھا مولانا حسن علی محدث نے جاری کیا دو برس بعد ۱۸۴۲ء میں کلکتہ سے تین پرچے جاری ہوئے۔ جنکے تفصیلی حالات معلوم نہیں۔

جام جہاں نما ہفتہ وار چھاپہ آہنی اور مخزن الادویہ جس کو ایک ایرانی حاجی آقا احمد خاں شیرازی نے جاری کیا تھا تین برس بعد ۱۸۴۵ء میں کلکتہ سے لیبی اور لکھنؤ سے احمدی جاری ہوا ۱۸۴۶ء میں احمدی کلکتہ سے اور خیالی لکھنؤ سے اور صدر الاخبار اور مدرسہ آگرہ سے جاری ہوئے صدر الاخبار کے مدیر ایک پادری ننک صاحب تھے۔ ۱۸۴۷ء میں اسعد الاخبار آگرہ سے جاری ہوا اور مراۃ الاخبار کلکتہ سے لیکن دونوں کے حالات معلوم نہیں ۱۸۴۸ء میں احمدی اور حیدری دہلی سے شایع ہوئے احمدی کا دفتر شاہراہ میں تھا۔ ۱۸۴۹ء میں "گلزار ہمیشہ بہار" کے نام سے ایک گلدستہ بنارس سے جاری ہوا اور یہ غالباً اُردو زبان کا پہلا گلدستہ تھا اسی کے ساتھ ایک ماہوار رسالہ "مراۃ العلوم" کے نام سے "گلزار ہمیشہ بہار" کے مطبع سے شایع ہونا شروع ہوا۔ اندور سے مدرسہ جاری ہوا اور ساتھ ہی ایک ہفتہ وار اخبار "مالوہ اخبار" کے نام سے شایع ہونے لگا یہ پہلا پرچہ تھا جس میں ناگری اور اُردو دونوں زبانیں مشترک کی گئیں ۱۸۵۰ء میں بمبئی سے "صادق" لاہور سے کوہ نور اور گجرانوالہ سے "گلزار پنجاب" جاری ہوئے "کوہ نور" اور "گلزار پنجاب" دونوں ہندو اہل قلم کے پرچے تھے۔ ۱۸۵۱ء میں اُردو دہلی اخبار کے نام سے (۸) ورق کا ہفتہ وار پرچہ جاری ہوا۔ ۱۸۵۲ء میں دہلی سے "حنفی" شایع ہوا جو ایک ہندی پرچہ تھا اس کے علاوہ لاہور سے "چشمۂ فیض" سیالکوٹ سے "خورشید عالم" جاری ہوئے، الہ آباد سے "نور الابصار" اور شاہ آباد سے "نور الانوار" اور دہلی سے "وحید الاخبار" بھی ۱۸۵۳ء میں جاری ہوئے۔

۱۸۵۳ء میں آگرہ سے "احمدی" اور "زبدۃ الاخبار" لکھنؤ سے "ذوالفقار حیدری" بنارس سے "مفاد ہندو" اور لاہور سے "ہمائے بے بہا" جاری ہوئے ان میں سے "مفاد ہند" نیم سرکاری پرچہ تھا جو ڈپٹی کمشنر کی سرپرستی میں جاری کیا گیا تھا ۱۸۵۴ء کے بعد سے اخبارات کی تعداد میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا رہا اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے بھی تعداد کے اس ترقی کو روکا نہیں بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد بھی روز بروز کثرت سے اُردو اخبارات جاری ہوتے رہے ۱۸۵۴ء میں ۹ نئے اخبار مختلف مقامات سے جاری ہوئے جن میں سے ایک اخبار گجرات سے اور ایک سورت سے جاری ہوا یہ غالباً اس حصہ ملک میں پہلے اُردو اخبارات تھے۔ ۱۸۵۵ء میں ۸ نئے اخبارات و رسایل جاری ہوئے انہیں سے "مذاق" رام پور غالباً پہلا مزاحی اخبار تھا۔

اُس کے انداز بیان اور ترکیب الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۵ء میں اُردو اخبار نویسی کی مذاقی انشاء پردازی کسی اونچی سطح پر نہ تھی۔

۱۸۵۵ء میں (۱۲) نئے اخبار و رسایل شایع ہوئے، اسی سال سب سے پہلے صوبہ مغربی و شمالی میں سرکاری گزٹ اُردو زبان میں شایع ہوا اور سب سے پہلے دو قانونی پرچے "ویکلی رپورٹ" گیا، اور "معدن القوانین" آگرہ سے جاری ہوئے

اس سال میں مذاقی اور تفریحی پرچوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا سنہ ۵۵ء میں (۸) جدید پرچے جاری ہوئے سنہ ۵۶ء میں میں بھی (۴) نئے پرچے جاری ہوئے جن میں "اُردو گائیڈ" کے نام سے اُردو کا پہلا روزانہ اخبار دو بڑے اوراق پر کلکتہ سے جاری ہوا اس کے مالک خان بہادر مولوی کبیر الدین تھے۔

غرضکہ میرا اندازہ یہ ہے کہ سنہ ۱۸۱۰ء تک (۸۳) اُردو اخبار جاری ہوئے ان میں سے عیسائیوں کے (۴) اور ہندو اہلِ قلم کے (۲۳) اخبار تھے اُس زمانہ میں اُردو زبان کی عالمگیر اہمیت کا اندازہ ان اعداد سے ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ اُردو اور ہندی کی تفریق سے اخبار نویسی کا یہ ابتدائی دور بالکل پاک تھا اور ہندو اہل قلم بھی زیادہ تر اُردو زبان ہی کو اپنے خیالات کا ترجمان بناتے تھے اُن حالات و اسباب کی طرف اشارہ کرنے کا یہ موقعہ نہیں ہے جنھوں نے بعد کے زمانے میں اُردو اور ہندی کے مسئلہ کو ہندو مسلم بنا دیا موضوعات کے اعتبار سے سوائے چند مسایل و مباحث کے اُس زمانہ کے اخبار نویسوں کی نظر کسی وسیع میدان کی طرف نہیں جاتی تھی، مذہبی مباحث، شعر و سخن، طب، قانون، مزاح بلکہ ہزل، اخبارات و رسایل کی صرف یہی پونجی تھی سیاست اور علوم جدیدہ سے ان پرچوں کے مباحث بالکل ناآشنا رہتے تھے یا اگر ایک بیرنگ اور معتدل سے زیادہ معتدل سیاست تھی بھی تو وہ صرف اُن چند پرچوں میں جو سرکاری افسران کی سرپرستی میں جاری تھے اور جن کا رخ ہمیشہ ایک خاص قسم کی سیاست کی طرف رہتا تھا۔ درحقیقت اُردو اخبار نویسی میں غدر کے بعد ہی زندگی کی خفیف حرارت پیدا ہوئی۔ اس زمانہ کا اخبار نویس اگر غدر سے پہلے کے اُس عہد پر نظر کرے تو اُس کو اپنے اس گرم انجام کا بہت ہی سرد آغاز نظر آئے گا۔ سنہ ۱۹۳۷ء سے آج تک اگر اُردو اخبار نویسی کا یہ میدان طے کیا جائے تو قدم قدم پر گزرے ہوئے اخبارات و رسایل کی ایسی بہت سی خبریں ایسے بہت سے کھنڈر نظر آئیں گے البتہ بطور دیکھا جائے تو دور اول کے آخری حصہ میں یہ فن ادبیات اور مذہبیات اور شعر و شاعری کے حدود سے گزر کر سیاسی مسایل کے شجر ممنوعہ کی طرف ڈرتا ڈرتا قدم بڑھانے لگا تھا۔

سنہ ۵۷ء کے بعد ہی حیدر آباد میں بھی اُردو صحافت کی تخم ریزی شروع ہوئی اور غالباً سب سے پہلے سنہ ۱۸۶۹ء میں سرکاری جریدہ اعلامیہ اُردو زبان میں شایع ہونا شروع ہوا اس کے بعد ایک ماہواری علمی رسالہ "مخزن الفواید" کے نام سے سنہ ۱۸۷۴ء میں جاری ہوا جو بہ اہتمام مولوی مسیح الزماں صاحب دار الطبع سرکار عالی سے شایع ہوا کرتا تھا اور اس کے مدیر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی (بی۔ اے) تھے پھر سنہ ۱۸۷۸ء میں نارائن سوامی صاحب کے ادارت میں رسالہ "مفید عام" جاری ہوا جو چھاؤنی رزیڈنسی سے شایع ہوا کرتا تھا اسی سال ان ہی نارائن سوامی صاحب نے (۶) ورق کا ہفتہ وار اخبار "آصف الاخبار" کے نام سے جاری کیا سنہ ۱۸۸۱ء میں گولکنڈہ سے شیخ خدا بخش اور شیخ نظام الدین نے ایک دو ورقہ ہفتہ وار جاری کیا۔ سنہ ۸۲ء سنہ ۸۳ء اور سنہ ۸۴ء میں کئی اخبار اور رسالے جاری ہوئے مثلاً بزم دکن، داستان سیاح۔ ذخیرۂ تعلیم۔ رفیق دکن، شاہ دکن، شگوفہ، شفق، علوم و فنون، معلم، شفیق،

مذاقِ سخن، ہزار داستان، پیکِ آصفی وغیرہ ان میں سے بعض کے خصوصیات قابلِ ذکر ہیں۔

ہندوستان کی طرح حیدرآباد کی صحیفہ نگاری کا یہ ابتدائی دور بھی زیادہ تر ادبی تھا اور ہم دیکھتے ہیں کہ دکن میں بھی اس دور میں مسلمان اور غیر مسلم اہلِ قلم دونوں اُردو زبانوں کی خدمت کر رہے تھے۔

اُردو صحافت کے دوسرے دور میں اُردو زبان کا سب سے زیادہ مشہور پرچہ "اودھ اخبار" ہے جو سنہ ۱۸۵۹ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا اور آج تک جاری ہے اس اخبار کے مالک منشی نولکشور مرحوم تھے جنھوں نے اپنی تمام زندگی اُردو زبان کی بہت قابلِ قدر خدمات میں گزاری۔

درحقیقت بیسویں صدی کے آغاز یعنے تقریباً چالیس سال تک ان کا مطبع اُردو زبان کے نشر و اشاعت کا سب سے بڑا مرکز تھا اور سب سے زیادہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ منشی نولکشور کے مطبع نے اُس زمانہ میں اسلامی ادب اور علوم کی جسقدر اشاعت کی اتنی کوئی ایک مطبع نہ اُس سے پہلے اور نہ اس کے بعد آج تک کرسکا اسلامی علوم کی بہت سی قدیم کتابیں اور قدیم اساتذہ کی بہت سی تصانیف صرف اسی مطبع کی وجہ سے بازار میں سہل الحصول بن سکیں۔ اُردو زبان کے ارتقا سے ایک غیر مسلم کا یہ تعلق اُس گزرے ہوئے زمانہ کو یاد دلاتا ہے جب کہ اُردو زبان ہندوستان کی مسلم و غیر مسلم آبادی کا ایک مشترکہ قومی سرمایہ تھی۔

اودھ اخبار کے علاوہ جو بلاشبہ اس زمانہ میں اُردو صحافت کا قائدِ اعظم تھا اس دور کے بعض دوسرے قابلِ ذکر جرائد میں جونپور کا اسحاقی دہلی کا "انجمن افروز" اور "حسینی" مدراس کا "شمس الاخبار" (جس کے مالک کا نام نصیر الدین گھٹالہ افندی تھا) "صبحِ صادق"، "طلسمِ خیال" اور "مدراس پنچ" تھے آخر الذکر دو اخبار پندرہ روزہ تھے۔

سنہ ۵۹ء میں دس نئے اخبار جاری ہوئے اور سنہ ۶۰ء میں (۲۳) جدید اُردو جرائد کی اشاعت شروع ہوئی جنمیں اکثر کے مدیر و مہتمم ہندو حضرات تھے اسی سال شیعہ جماعت کا پہلا اخبار "اثنا عشری" لکھنؤ وزیر گنج محلہ فراش خانہ سے جاری ہوا اس اخبار کے مالک سید عابد علی تھے۔ اسی سال بریلی سے ہندی کا پہلا ہفتہ وار اخبار "بریلی تت بودھنی پترکا" جاری ہوا۔

سنہ ۶۱ء میں (۱۵) جرائد جاری ہوئے جن میں ممتاز ترین ایک ہندو صاحبِ قلم بابو دکھنا رنجن کا اخبار "ہندوستانی" تھا جو بیسویں صدی کے آغاز تک جاری رہا اور اپنے زمانہ میں ایک نمایاں سیاسی حیثیت رکھتا تھا بعد کو کانگرس کے ابتدائی زمانہ میں یہ اخبار اُس کانگریسی جماعت کے خیالات کا نمایندہ بنا جو اس زمانہ میں انتہا پسند حقوق طلب جماعت تصور کی جاتی تھی اور آج ایک بوسیدہ شکل میں ماڈریٹ لبرل جماعت یا جماعت معتدلین کہلاتی ہے درحقیقت "ہندوستانی" اُس زمانہ کے سب سے زیادہ بیدار سیاسی احساسات کی ایک موثر آواز تھی۔

"ہندوستانی" کے علاوہ اس سال کے جدید جرائد میں (۶) اور بھی ایسے پرچے تھے جن کی ادارت غیر مسلم حضرات کے ہاتھ میں تھی۔

اس سال لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل کا پہلا اخبار "نجم العلوم" جاری ہوا سنہ ۶۲ء میں (۱۳) جدید جرائد جاری ہوئے

جن میں سے "نور العلم" اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شایع ہوتا تھا اور اس کا مقصد زیادہ تر جدید تعلیم کی طرف اہلِ ملک کو راغب کرنا تھا، غالباً پہلا طبی رسالہ بھی اسی سال لاہور سے جاری ہوا اُس کا نام "مجرِ حکمت" تھا اور اُس کے اڈیٹر لالہ نرسکھ رائے تھے ہندوؤں کا پہلا مذہبی اخبار "گیان پرکاش" بھی اسی زمانہ میں آگرہ سے شایع ہوا۔

سنہ ۶۳ء میں (۷) نئے پرچے جاری ہوئے جن میں قابل ذکر "انجمن اسلامی" تھا جس کو کلکتہ سے آنریبل عبدالطیف خان بہادر شایع کیا کرتے تھے۔

سنہ ۶۴ء میں (۱۰) نئے اخبار جاری ہوئے جن میں قانون کا ماہوار رسالہ "مخزن القوانین" کے نام سے بابو پیارے لال موہن بنرجی نے جاری کیا تھا۔

سنہ ۶۵ء میں (۱۲) نئے جرائد جاری ہوئے جن میں "مٹیا برج" کا "سلطانی" اور ہندوؤں کا ایک مذہبی پرچہ "گیان دتی تریکا" کے اغراض و مقاصد کی تصریح جن الفاظ میں کی گئی تھی اُس کا ایک نمونہ پیش کرتا ہوں جو اس زمانہ کے طرزِ نگارش کا بھی ایک دلچسپ نمونہ ہے:

> اس میں اشلوک ہائے اصل صحایف قدیم سنسکرت مع ترجمہ بزبان بھاشا اور بیان معانی شرتی ہائے بید وغیرہ و تشریح اور مضامین شاستر ہائے معرفت و حقایق و علمی و عملی پند و مواعظ مفید خلایق و انواع حکمات ہر گونہ کار آمد و احوال دورہ زماں خصوصاً دامنِ حقیقت و اصل مراد و نیز تنقید کلام درج ہوتے ہیں۔"

اس عبارت کی ترکیب نحوی و لغوی پر اگر اب اعتراض نہ کریں تو اُس زمانہ کی صحیفہ نگاری پر فارسی اور عربی کے تراکیب کا جو اثر قایم تھا اُس کی حقیقت ان الفاظ سے ہویدا ہوتی ہے یہ گویا آج سے (۷۵) سال پہلے کی صحافتی اُردو کا اسلوب بیان تھا۔

سنہ ۶۶ء میں (۱۹) نئے اخبار و رسایل جاری ہوئے جن میں اہم ترین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ تھا جو سر سید احمد خاں کی سائنٹیفک سوسائٹی کے سرپرستی میں شایع ہوا کرتا تھا اور جس نے بلاشبہ اس زمانے کے مسلمانوں کے ذہنی انقلاب میں ایک نمایاں حصہ لیا اُس کے پہلے اڈیٹر مولوی محمد اسمٰعیل صاحب تھے اور بعد کو خود سر سید احمد خاں اُس کے اڈیٹر ہوئے۔

اس سال کا دوسرا قابلِ ذکر اخبار "اکمل الاخبار" تھا جو دہلی سے جاری ہوا تھا اور جس کا تعلق شریف خاندان اطبار سے تھا خود مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم اپنی نوجوانی کے زمانہ میں "اکمل الاخبار" کے لئے مضامین لکھا کرتے تھے اور اسکے علاوہ مرحوم کبھی کبھی اس اخبار کی کتابت بھی کیا کرتے تھے اسی زمانہ میں دہلی سے ایک دوسرا اخبار "اُردو اخبار" کے نام سے جاری تھا جس کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں لیکن اُس کی بعض خصوصیات کا ذکر اس موقعہ پر کرنا چاہتا ہوں یہ اخبار ایک روزنامچہ تھا اور ہندوستان کے مختلف مقامات کی خبریں اس میں اس طرح درج کی جاتی تھیں کہ بجائے ہر خبر کی سرخی کے ہر مقام کی سرخی قایم کی جاتی تھی اور اُس کے تحت اُس مقام کی سب خبریں یکجا لکھی جاتی تھیں ان اوراق کے ایک

حصہ میں دربار شاہی اور لال قلعہ کی خبریں درج کی جاتی تھیں اڈیٹوریل یا ادارتی تنقید بالکل نہ ہوتی تھی اس اخبار کی چند جلدیں حیدرآباد میں ادارۂ ادبیات کے کتاب خانہ میں موجود ہیں۔

دہلی میں اُس زمانہ کا اسلوب بیان اور طرزِ نگارش جو کچھ تھا اُس کے دو تین نمونے "اُردو اخبار" کے صفحات سے نقل کرتا ہوں۔

مثلاً "اُستاد ذوق" کی وفات کا یوں ذکر کیا جاتا ہے:

خبر حسرت اثر رحلت الملک الشعرا خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق اُستاد خاص حضور اقدس حضرت ظل سبحانی افسوس صد افسوس کہ شہنشاہ ملک سخنوری خسرو اقلیم معنی گستری ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم خاں ذوق اُستاد خاص حضور والا نے شب ۲۴ صفر شب آخری چہار شنبہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء عالم فانی سے بسوئے عالم جاودانی رحلت کی۔ الحق یہ وہ مصیبت عظمیٰ ہے کہ اگر صاحب زبان محاورہ فرس و ریختہ و اردو بلکہ تمام اہل سخن ہند لباس ماتمی پہن لیں تو روا ہے، حضور والا کو جب اطلاع اس واقعہ جانکاہ کی ہوئی باوجودیکہ دربار عام بتقریب آخری چہار شنبہ مہیا تھا اور سب اراکین سلطنت باریابی مجرے کو حاضر لیکن سب کو برخاست کر دیا اور حکم دیا کہ شاہزادگان والا تبار مع جمیع اہل دربار اُستاد مرحوم کی مشایعت جنازہ میں شریک ہوں"۔

دہلی اُردو اخبار - ۳ر مارچ ۱۸۵۱ء

اُس زمانہ کی صحافت کا ایک دوسرا نمونہ ملاحظہ ہو، سفر حج کے متعلق ایک اطلاع درج کی جاتی ہے:

مشتاقان تفریح دیار و امصار اور سیاحان پختہ کار کو مژدہ ہو کہ بشرط شوق و ہمت اب عرب و عجم اور روس و شام و انگلستان کے جانے کے لئے بہت سہولت و آرام کا راستہ نکلا ہے یعنے فیروزپور یا لاہور سے کشتی پر سوار ہو کر بہ آرام تمام سندھ یا بمبئی تک آدمی پہونچ سکتا ہے اور کچھ خوف چوری چکاری کا اثنائے راہ متصور نہیں ہے اگر لاہور سے سوار ہوا از راہ دریائے راوی (۱۲) دن میں ملتان پہونچ سکتا ہے اور وہاں سے بکرے گھاٹ میں کشتی دخانی پر سوار ہو کر پچاس ساٹھ روپیہ کے صرف میں بہ آرام تمام کراچی تک بے خوف و خطر پہونچ سکتا ہے اور کراچی سے بمبئی تک تین چار روز میں بصرف قلیل طے مسافت کر سکتا ہے اور اگر فیروزپور سے سوار ہوئے تو براہ بھاگپور جاچڑ اور سکھر اور حیدرآباد سندھ تک کشتی پر چلا جاوے اور کرایہ بھی ارزاں ہے حتیٰ کہ اگر ساری کشتی کرایہ کو لیوے تو بھی دو سو روپیہ سے زیادہ صرف نہ ہو اور گھورا باری سے براہ نگر ٹھٹھ براہ خشکی دو روز میں کراچی پہونچ جائے اور کراچی اور بمبئی سے مسافر کو اختیار ہے کہ خواہ جہاز دخاں یا جہاز دخانی پر سوار ہووے مگر جہاز دخانی تیز رو اور بے خطر سواری ہے الا کرایہ زیادہ ہے۔

دہلی اُردو اخبار ۲۳ر مارچ ۱۸۵۱ء

حکومت اور انگریزی حاکموں کی تعریف میں بھی اُردو اخبار کا جو رنگ تھا وہ اس زمانہ کی صحافت کا عام رنگ تھا مثلاً ایک قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے:-

مضمون مراخصت جان پائن گبسن صاحب

اے سعادت شعار عادل پناہ　　جان پائن گبسن عالی جاہ

غرض یہ کہ "المل الاخبار" کا رنگ بھی یہی تھا اور اس رنگ میں بہت عرصہ تک کوئی تغیر نہیں ہوا۔

سنہ ۶۷ء میں (۱۶) نئے پرچے جاری ہوئے جن میں پہلا اخبار جاری ہوا جس کا نام "بدیا بلاس" تھا اُس نے کے مالک پنڈت بنکٹ رام شاستری تھے اس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ اُس میں اُردو کے ساتھ ناگری بھی شامل تھی اس زمانہ میں ہندوستانی ریاستوں میں صحافت کا چرچا شروع ہو چلا تھا چنانچہ کشمیر کے علاوہ بنارس سے "بنارس گزٹ" رام پور سے "دبدبۂ سکندری" (جو ابھی تک جاری ہے) سہارنپور سے صادق الاخبار اور اخلاق الانوار اور جاورہ سے محتشم جاری ہوئے

سنہ ۶۸ء میں (۱۸) اور سنہ ۶۹ء میں (۲۳) نئے اخبار جاری ہوئے ان میں "آگرہ اخبار" اور "مفید عام" آگرہ بہت مشہور تھے حیدر آباد کا جریدہ اعلامیہ بھی سنہ ۶۹ء میں جاری ہوا اُس وقت اُس کے مہتمم مرزا زین العابدین شیرازی تھے اور دار الطبع سے چار ورق پر ہفتہ وار شایع ہوتا تھا۔

سنہ ۷۰ء میں (۱۹) نئے اخباروں کی اشاعت شروع ہوئی جن میں "اتالیق پنجاب" تعلیمی پرچہ تھا جس کے اڈیٹر اُس زمانہ کے اہل قلم اور ادیب تھے یعنے بابو پیارے لال اور مولانا محمد حسین آزاد مولف دربار اکبری و آب حیات وغیرہ

سنہ ۷۱ء میں (۲۰) نئے پرچے جاری ہوئے جن میں زیادہ مشہور "اخبار عام" لاہور تھا اُس کے مالک پنڈت مکندرام تھے یہ پرچہ ہفتہ میں تین مرتبہ شایع ہوتا تھا اور اُس زمانہ کے سیاسی مسایل پر اچھے مضامین لکھتا، اس سال دوسرا قابلِ ذکر پرچہ "تہذیب الاخلاق" جاری ہوا جس کے اڈیٹر سر سید احمد خاں تھے سر سید نے اپنے زورِ قلم سے نہ صرف مذہبی قدامت پرستی کے تنگ دایرہ کو وسیع کرنے کی کوشش کی بلکہ اُردو انشا پردازی اور طرز نگارش کا ایک نیا دور شروع کیا۔

بہت کم لوگوں نے اس بات کو یاد رکھا ہے کہ سر سید احمد خاں صرف قومی لیڈر اور مصلح اور مسلم یونیورسٹی کے بانی ہی نہ تھے بلکہ اُردو زبان کے ایک بڑے ادیب اور صاحب قلم تھے اُن کے زورِ قلم اور ان کی صحافت نے درحقیقت اُردو ادب کا ایک نیا دور شروع کیا تھا جس کے درخشندہ ستارے حالی، شبلی، نذیر احمد اور محسن الملک جیسے لوگ تھے، "تہذیب الاخلاق" نے بہت گرم مذہبی بحث تمام ملک میں چھیڑ دی اور عرصہ تک اسی پرچہ کے ذریعہ سے مذہبی مسایل کے متعلق سر سید اپنے اخبارات اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے رہے اس میں شبہ نہیں کہ یہ پرچہ اُردو زبان کا پہلا معیاری پرچہ تھا اور اُس کا نام ہندوستان کی تاریخ صحافت میں ہمیشہ روشن رہے گا۔

اُردو صحافت کا تیسرا دور گویا اس زمانہ کی صحافت کا وہ عہد شباب تھا اور اس دور میں جس قدر نئے جراید جاری ہوئے شاید اس کے بعد سنہ ۱۹۰۰ء سے پہلے اس قدر کثرت سے کبھی جاری نہیں ہوئے۔

۱۸۷۲ء میں (۲۳) نئے اخبار جاری ہوئے جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر "ماہنامہ دہلی سوسائٹی" تھا جس کے اڈیٹر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم تھے جو بعد کو بہت بڑے ادیب اور تاریخ نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

۱۸۷۳ء میں (۲۰) اور ۱۸۷۴ء میں (۲۴) نئے جراید جاری ہوئے اُن میں دو پرچے قابلِ ذکر ہیں ایک "وکیل" امرتسر جو ہفتہ وار (۸) ورق پر شایع ہوتا تھا اور دوسرا "مخزن الفواید" جس کو حیدر آباد سے مولوی مسیح الزماں صاحب نے جاری کیا تھا "وکیل" صحافت کی دُنیا میں عرصہ تک خاص اہمیت رکھتا تھا اور ایک زمانہ میں تو وہ چوٹی کا پرچہ تھا اُس نے ملکی مسائل کے متعلق سنجیدہ نگاری کا ایک نیا معیار قایم کیا اور اپنے زمانہ میں وہ اُردو اخباروں کا بڑا بھائی سمجھا جاتا تھا اُسکو ایک یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ اُس کے ادارہ میں ابوالکلام آزاد جیسے صاحب قلم نے اپنی صحافتی زندگی شروع کی تھی مخزن الفواید حیدر آباد کے اڈیٹر مولوی سید حسن بلگرامی مرحوم تھے۔

۱۸۷۵ء میں (۲۵) نئے جراید جاری ہوئے ان پرچوں میں "جریدۂ روزگار" مدراس بہت مشہور ہوا لیکن اُس سے بھی زیادہ مقبول (اُس زمانہ کے مذاق کے اعتبار سے) حضرت ریاضؔ مرحوم کا جاری کیا ہوا "گلدستہ ریاض" تھا جو ان کی شاعری کا آئینہ دار تھا اور عرصہ تک اربابِ سخن میں بہت محبوب رہا۔

۱۸۷۶ء اور ۱۸۷۷ء میں (۴۵) نئے اخبار جاری ہوئے جن میں زیادہ مشہور لکھنؤ کا "اودھ پنچ" تھا جس کی زندگی گزشتہ سال ہی ختم ہوئی ہے "اودھ پنچ" کا ابتدائی دور بہت شاندار تھا اور اُسوقت ہندوستان کے مزاحیہ صحافت میں اُس کا درجہ بہت بلند تھا اُس زمانہ میں اُردو زبان کے بہترین اہلِ قلم اُس کے صفحات پر نظر آیا کرتے تھے، عبدالغفور شہبازؔ، رتن ناتھ سرشارؔ، شررؔ، اکبرؔ الہ آبادی اور بہت سے مشاہیر اودھ پنچ کی بزم طرب کے آبادی تھے خود اس کے اڈیٹر سید سجاد حسین ایک بلند پایہ مزاح نگار تھے۔

اسی زمانہ میں شمالی ہند میں پہلا روزانہ اخبار "قیصر الاخبار" الہ آباد سے جاری ہوا۔

۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۰ء تک (۷۵) نئے اخبار و رسایل کی اشاعت شروع ہوئی ان میں آریوں کا پہلا مشہور اخبار "آریہ درپن" آریہ سبھا کی جانب سے جاری کیا گیا آریہ سماج کے پروپیگنڈہ کا یہ ابتدائی دور تھا اور مختلف مقامات سے آریوں کے مذہبی پرچے نکلنے شروع ہوئے مثلاً آریہ بھوشن شاہجہاں پور سے، آریہ سماچار، میرٹھ سے "دھرم پرکاش" کپورتھلہ سے اور "بلدیو پرکاش" آگرہ سے۔

ترکوں کی تحریک اتحاد اسلامی کے تحت اسی زمانہ میں اُردو کا ایک اخبار قسطنطنیہ سے بھی جاری ہوا جس کا نام "ترجمان شرق" تھا اسکندر آفندی اُس کے مدیر تھے سلطان عبدالحمید خاں کی تحریک کو ہندوستان تک پہونچانے کا یہ گویا ایک وسیلہ تھا جو غالباً سلطان کی تحریک اور امداد سے جاری ہوا تھا۔

اسی دور میں حیدر آباد سے "آصف الاخبار" جاری ہوا جس کے مدیر نارائن سوامی تھے اور وہ مفید عام پریس

سے شایع ہوا کرتا تھا اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ عیسائی مذہب کے مشہور مبلغ پادری رجب علی نے اخبار "سفیر ہند" امرتسر سے جاری کیا "آریہ درپن" اور آریوں کے دوسرے پرچوں کی طرح اس پرچہ نے بھی مذہبی مناقشہ کا ایک میدان پیدا کیا چنانچہ اُس زمانہ میں مذہبی عقاید کے بحث کے اکھاڑے میں زیادہ تر آریوں اور عیسائیوں کی کشتی ہوا کرتی تھی۔

اُردو صحافت کی گرماگرمی کا خاص زمانہ ۱۸۸۱ء اور ۱۸۸۵ء کا درمیانی زمانہ تھا جس میں سیکڑوں نئے اخبار اور بعض بہت مشہور جرایہ جاری ہوئے ۱۸۸۱ء میں (۴۹) نئے پرچے جاری ہوئے ان میں سے لاہور کے دو پرچے "کوہ طور" اور "مفید عام" بہت مشہور تھے، میرٹھ سے "طوطی ہند" جاری ہوا جو عرصہ تک جاری رہا اور آخر میں محض ایک ادبی پرچہ ہو کر رہ گیا تھا اسی سال حیدرآباد سے "شفق" جاری ہوا اس کے جاری کرنے والے سید حسین صاحب رضوی تھے، اُس کا حجم (۲) ورق تھا اور وہ ہر یکشنبہ کو شایع ہوا کرتا تھا اس پرچہ کے اغراض و مقاصد اُس کے صفحۂ اول پر اس طرح بیان کئے گئے تھے:۔

"یہ اخبار کسی خاص مذہب و ملت کا طرفدار نہیں۔ جو حق بات ہوگی اسے صاف صاف ظاہر کر دے گا معاملات ملکی و غیر ملکی پر بحث کرتا رہے گا اور آزادانہ رائے دے گا رعیت کا ہر حال میں مددگار رہے گا اور اُن کی دادرسی کی کوشش کرے گا حاکم و محکوم میں سلسلہ اتحاد کا بانی اور عناد کا بیخ کن ہوگا۔ اطلاعات مفید شایع کرنا اور بلاد و امصار کے اخبار عمدہ کا لکھنا اور خاص ملک کی اچھی اور بری بات سے آگاہی دینا اور مہذب ملکوں کے طرز تمدن اور معاشرت سے خبردار کرنا اُس کا فرض منصبی ہوگا"

آج سے (۶۰) سال پہلے حیدرآباد کے صحافت کا یہ دلچسپ خاکہ ہے اُس زمانہ کی سیاست کے اعتبار سے معاملات ملکی و غیر ملکی پر آزادانہ رائے دینے ادعا شاید "شفق" کے مدیر کی پہلی جرأت تھی۔

۱۸۸۲ء میں (۸۰) نئے جرائد جاری ہوئے جن میں حیدرآباد کا "معلم شفیق" بہت زیادہ قابلِ ذکر ہے اس رسالہ کے اڈیٹر مولوی محب حسین صاحب مترجم دفتر معتمدی مالگذاری تھے اور غالباً حیدرآباد کا یہ پہلا پرچہ تھا جس نے ملک میں جدید خیالات کی اشاعت شروع کی اور بعض مذہبی مسایل میں بھی بہت جرأت کے ساتھ قدامت پسندی اور تنگ نظری کا مقابلہ کیا عورتوں کے حقوق اور پردہ کے متعلق بہت دلچسپ مباحث اس کے صفحات پر پیش کئے گئے۔

"معلم شفیق" کی ادارت کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ اس نے ترجموں کے ذریعہ سے اہل ملک کو جدید علوم سے روشناس کرنا شروع کیا یہ پرچہ پہلے تو ماہوار شایع ہوا کرتا تھا اس کے بعد اگست ۱۸۸۴ء سے ہفتہ وار شایع ہوتا تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ علامہ سید جمال الدین افغانی حیدرآباد میں مقیم تھے اور اُن کے بعض مشہور مضامین بھی اسی رسالہ میں شایع ہوئے مولوی محمد اور احسن صاحب اکثر علامہ کی صحبت میں شریک رہا کرتے تھے اور تعجب نہیں کہ معلم شفیق نے اُس زمانہ میں جو اُردو صحافت میں رنگ اختیار کیا تھا وہ علامہ افغانی کی صحبتوں ہی کا نتیجہ ہو۔ اسی سال مولوی محب حسین صاحب ہوئے شاید اس کے بعد رسالہ جاری کیا جس کا نام اسلامیہ تھا۔

۱۸۸۳ء میں (۸۴) نئے پرچے جاری ہوئے اور حیدر آباد سے بھی چار پانچ پرچے جاری ہوئے مگر یہ زمانہ زیادہ تر شعر و سخن اور مزاح نگاری کا زمانہ تھا طبایع اسی جانب زیادہ راغب تھے اور حیدر آباد میں مولوی محب حسین صاحب جیسے لوگ کم تھے ستمبر میں حیدر آباد سے ایک ماہواری پرچہ "مذاق سخن" جاری ہوا جس کے مدیر مشتاق احمد صاحب تھے وہ مطبع علوم و فنون سے طبع ہو کر محلہ مغلپورہ سے شایع ہوا کرتا تھا اس گلدستہ کا عنوان حسب ذیل تھا:

"میرے مزار کا ہر گل جنت ہے
چشم انصاف سے دیکھیں جو طبیعت والے

اس گلدستہ میں قصائد مدحیہ، غزلیات طرح و غیر طرح کا انتخاب، پاکیزہ مضامین، نیچرل شاعری، دلچسپ انگریزی ناول کا سادہ ترجمہ، پھڑکتے ہوئے افسانے درج ہوتے ہیں"

عنوان کا ڈیڑھ مصرعہ والا شعر خود ہی اُس زمانہ کی شاعری کے عام مذاق کا پتہ دیتا ہے حیدر آباد میں اُردو صحافت کا یہ دور انگریزی ناولوں کے ترجموں اور پھڑکتے ہوئے افسانوں کا دور تھا۔

دوسرا گلدستہ "گلکدۂ مشتاق" کے نام سے ان ہی مشتاق احمد صاحب نے جاری کیا پھر انھیں صاحب نے فنون کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جس کے عنوان کی عبارت حسب ذیل تھی:

"زراعت و تجارت و صنعت کی ترقی دینے کے واسطے یہ ماہواری رسالہ (۲۰) ورق خورد مطبع علوم و فنون حیدر آباد دکن محلہ مغل پورہ مکان حافظ منصب علی سے مشتاق احمد احقر نے یکم مئی کو جاری کیا اب ڈیوڑھی نواب قوی جنگ بہادر کا رخانہ فنون و مذاق سخن وغیرہ سے باہتمام مسٹر جونس اڈیٹر کے شایع ہوتا ہے"

اسی سال شعر و سخن کا ایک ماہوار پرچہ "شگوفہ" کے نام سے محلہ دارالشفا میں باہتمام مولوی سید حسن حشمت بلگرامی جاری ہوا اُس کے مالک سید احمد صاحب زید بلگرامی تھے ایک اور ماہوار پرچہ افضل گنج سے جاری ہوا جسکا نام "داستان سیاح" تھا اُس کے اڈیٹر منشی سید ابراہیم عفو مترجم دفتر محاسب سرکاری تھے۔

ہندوستان میں اس سال ہندوؤں کے بھی بہت سے نئے پرچے جاری ہوئے جن میں زیادہ مشہور "دیش اپکارک" لاہور "رفاہ عام" جھجر "زیب کاشی" "ست پرکاش" الہ آباد "سری دربار" ہاڑوواڑ "سکھ دیک سبھا" راولپنڈی وغیرہ تھے اسی سال کا ایک مشہور پرچہ "تحفۂ ہند" تھا جو میرٹھ سے شایع ہوا کرتا تھا اس کے عنوان پر مقاصد کا اعلان یوں کیا جاتا تھا کہ:

"دیسی زبان کی انشا پردازی کی اصلاح کرے گا اور بتائے گا کہ تہذیب اور فصیح بلیغ انشا پردازی اس کو کہتے ہیں۔ سوشل اور پولیٹکل اُمور پر آزاد مگر خیر خواہی کے ساتھ نکتہ چینی کرے گا مدبرانہ مصلحانہ و حکیمانہ و شاعرانہ و عالمانہ و فاضلانہ غرضکہ ہر قسم کے خیالات شایع کرے گا مذہبی تعصب کو پاس نہ پھٹکنے دے گا ہندوستانی ریاستوں کی اصلاح کرے گا اور بتلائے گا کہ

اُن کو موجودہ زمانہ میں کیا کرنا چاہئے اقوام ہندوستان میں عموماً اور اہل اسلام میں خصوصاً اتفاق کے پیدا کرنے اور نیشنلیٹی کے قایم کرنے میں ساعی ہوگا۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اُردو زبان کی صحافت میں بھی نیشنلسٹی کے کچھ دھندلے تصورات پیدا ہو چلے تھے۔ اسی زمانہ کا دوسرا مشہور اخبار "ہندوستانی" تھا جس کے مالک منشی گنگاپرشاد ورما تھے یہ ہفتہ وار پرچہ تھا اور اس میں ناگری بھی شریک تھی۔

۱۸۸۲ء میں (۱۰۱) جدید پرچے جاری ہوئے ان میں سے دو حیدرآبادی رسالے تھے ایک "ذخیرۂ تعلیم" جو رزیڈنسی سے (۲۴) ورق پر شایع ہوتا تھا اس کے اڈیٹر مولوی عزیزالدین مدرس اول فارسی مدرسہ انگریزی سرکاری تھے یہ رسالہ دارالطبع میں چھاپا جاتا تھا دوسرا پرچہ "رفیق دکن" تھا جو سررشتہ تعلیم کا ماہوار رسالہ تھا۔

اسی سال خواتین کا ایک اچھا پرچہ جو غالباً اپنی قسم کا پہلا پرچہ تھا لکھنؤ سے جاری ہوا اس کا نام "رفیق نسواں" تھا مگر یہ عیسائیوں کا پرچہ تھا اور امریکی مشن لکھنؤ اس کو زیادہ تر مفت تقسیم کرتا تھا۔

اسی زمانہ میں لندن سے بھی ایک اُردو کا اخبار جاری ہوا اس کا نام ہندوستان تھا اور اس کے اڈیٹر کوئی پیٹل صاحب تھے جو غالباً مشنری تھے اس اخبار کے مالک اودھ کے مشہور تعلقدار راجہ رام پال سنگھ تھے، جس قسم کی اُردو زبان اس پرچہ میں لکھی جاتی تھی اس کا ایک مختصر نمونہ حسب ذیل الفاظ ہیں جن میں اخبار کے اغراض و مقاصد کی صراحت کی گئی ہے۔

"خبر دینے کا اور بدلنے کا انگریزی اور ہندوستانی خیالات ان باتوں میں جو متعلق ہیں اُمور سلطنت علم وہنر میں جس کا پہلا کالم اُردو دوسرا انگریزی، تیسرا ناگری۔"

گویا یہ اُس زمانہ میں لندن کی اُردو زبان تھی، یہ گویا تقریباً ایک صدی کی اُردو زبان کا صحافتی انداز تحریر ہے اس کے بعد چوتھا دور شروع ہوتا ہے۔ ۱۸۸۴ء میں (۹۴) نئے اخبار جاری ہوئے جن میں سے دو حیدرآباد کے تھے ایک "جوہر سخن" جو کوچہ جلال سے شایع ہوتا تھا اور ایک "گلدستہ" جس کے مالک عبداللہ خاں ضیغم داماد نواب شرف الامرا تھے، یہ پرچہ مطبع آصفی محاذی پُرانی حویلی میں چھپتا تھا اور اس کے سرپرست حسام الملک نواب خان خاناں تھے۔ ۱۸۸۵ء میں (۹۵) نئے اخبار جاری ہوئے جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر "زمیندار" ہے جو گجرانوالہ سے پہلے ماہوار اور پھر ہفتہ وار منشی محبوب عالم نے جاری کیا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں حیدرآباد سے پانچ نئے پرچے جاری ہوئے جن میں سے چار "گلدستے" تھے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں حیدرآباد میں شعر و سخن کا بہت چرچا تھا ان چار میں سے ایک "گلزار سخن" تھا جس کے مالک نورالدین صاحب تھے اور یہ مطبع نور میں طبع ہوتا تھا اس گلدستہ کے سرورق پر یہ شعر لکھا ہوا ہوتا تھا۔

مزا نہیں ہے خموشی کا خوش بیاں کے لئے
زباں سخن کے لئے ہے سخن زباں کے لئے

دوسرے گلدستہ کا نام "گل و بلبل" تھا اس کے مالک الطاف حسین بسمل تھے اس کے سرورق پر حسب ذیل شعر نمایاں تھا:-

وہ بہار آئی وہ غنچے ہنس کے شرمانے لگے
گوش گل تک نغمۂ بلبل بھی اب جانے لگے

تیسرا گلدستہ "خیال محبوب" تھا اسکے مالک مولوی عبدالسلام عرشی تھے اور وہ نظام پریس سے شایع ہوا کرتا تھا۔

چوتھا مزاحیہ گلدستہ "دکن پنچ" تھا جس کا دفتر بازار شیدی عنبر میں تھا۔ اس کے مالک کشن راؤ تھے۔ مہتمم عبدالکریم ظریف اور اڈیٹر غریب الدین۔

پانچواں اخبار جو اس زمانہ میں حیدرآباد سے جاری ہوا "افسر الاخبار" تھا جو قلعہ گولکنڈہ سے شایع ہوتا تھا اسکے مالک مشتاق احمد تھے۔

اس سال کا ایک ممتاز پرچہ جو عورتوں کے لئے جاری کیا گیا تھا دہلی کا اخبار النساء تھا جس کے اڈیٹر مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ تھے۔

اسی سال کے آخری حصہ میں لاہور سے "پیسہ اخبار" جاری ہوا جو آج تک مختلف صورتوں میں جاری ہے اس اخبار کے مالک مولوی محبوب عالم کا نام شمالی ہندوستان بلکہ تمام ہندوستان کی صحافت میں ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے وہ شاید سب سے پہلے تعلیم یافتہ پنجابی تھے جنھوں نے صحیح تجارتی اصولوں کو مدنظر رکھ کر صحافت کا فن اختیار کیا اور وہ اُردو صحافت کے اُن چند خوش قسمت اہل قلم میں سے تھے جنھوں نے اس پیشہ میں شہرت بھی حاصل کی اور دولت بھی۔

۸۸ء کے بعد اُردو صحافت کا ایک ایسا دور آیا جس میں نئے پرچوں کی تعداد سال بہ سال کم ہوتی ہی اس سال کے (۱۲) نئے پرچوں میں زیادہ قابل ذکر لکھنؤ کا "وکیل قومی" ہے جس کو اس زمانہ کے ایک مشہور واعظ مقرر اور صاحب قلم "عبداللہ حسرتی" نے جاری کیا تھا لیکن یہ پرچہ کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔

۸۹ء میں صرف ایک نیا ہفتہ وار "بھارت سدھار" لاہور سے جاری ہوا یہ ہندو انتہا پسندوں کا پرچہ تھا اور اس کا سیاسی رنگ بہت نمایاں تھا۔

۹۰ء میں صرف تین پرچے جاری ہوئے۔ ۹۲ء میں صرف چار نئے پرچے جاری ہوئے جن میں پٹیالہ کا "مخبر صادق" کسی قدر مشہور ہوا اس کے اڈیٹر شیخ ضیاء الحق تھے جو مختلف ریاستوں کے متعلق پمفلٹ شایع کرنے کے سلسلہ میں اچھی طرح جانے پہچانے جاتے تھے۔

۹۴ء میں چار پرچے جاری ہوئے جن میں کوئی بھی قابل ذکر نہیں۔ ۹۵ء میں لاہور سے "انتخاب لاجواب" جاری ہوا جو ابھی تک جاری ہے یہ اپنی قسم کا پہلا پرچہ تھا جس کو انگلستان کے اخبار "ٹٹ بٹس" کے اصول پر جاری کیا گیا تھا۔ منشی محبوب عالم کے بھائی منشی عبدالعزیز اسکے اڈیٹر تھے یہ پرچہ ایک زمانہ میں بہت کامیاب ہوا اور اب تک جاری ہے۔

سنہ ۹۶، ۹۷، ۹۸ء میں کوئی نیا پرچہ جاری نہیں ہوا البتہ سنہ ۹۹ء میں لاہور سے صرف ایک پرچہ "پیشوا" جاری ہوا جس کو شیخ ضیاء الحق نے جاری کیا تھا یہ پرچہ ایک طرف تو اُس زمانہ کے انتہا پسند سیاست کا ترجمان تھا اور دوسری طرف ہندوستانی ریاستوں کے مسایل پر بہت زیادہ لکھتا تھا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں (۲۰) نئے پرچے جاری ہوئے مگر اُن میں قابل ذکر ایک تو مرزا حیرت کا کرزن گزٹ تھا جس نے مذہبی مباحث میں اور خصوصاً حادثۂ کربلا کی اصلیت سے انکار کر کے بہت شہرت حاصل کی اور دوسرا "شمشیر قلم" لاہور تھا جس کے اڈیٹر اُس زمانہ کے ایک مشہور صحیفہ نگار نثار علی شہرت تھے اسی سال مدراس مولوی عبداللطیف قادری کا جریدۂ روزگار شروع ہوا جو عرصہ تک جاری رہا اور ایک زمانہ میں جنوبی ہند کا ایک ممتاز پرچہ سمجھا جاتا تھا۔

یہ نصف صدی سے زیادہ کی ایک مختصر داستان ہے جو بیان کی گئی۔ سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد ہم اب اُردو صحافت کے دورِ جدید کے دروازہ پر آگئے ہیں اور یہ وہ منزل ہے جہاں اُردو صحافت نے ایک انقلاب انگیز کروٹ لی۔ گزشتہ نصف صدی میں عام طور پر اُردو زبان کے صحیفہ نگاروں کے قلم کی جولانی کا میدان سیاسی مسایل کی سرحد پر ختم ہو جاتا تھا۔ خبروں یا افسانوں یا غیر سیاسی مضامین کے ترجموں کے علاوہ اُس زمانہ تک اُردو صحافت کا ایک بدنما پہلو ذاتیات کا وہ رجحان تھا جس نے بہت سے جراید کو استحصال بالجبر تخویف مجرمانہ یا بھیک مانگنے اور بڑے آدمیوں کے قصیدہ خوانی کرنے کا ایک پیشہ بنا دیا تھا اُس زمانہ کے بیسیوں جراید کا سرمایۂ تجارت بھی تھا کہ وہ رؤسا، سے کسی نہ کسی طرح روپیہ وصول کرلیں ایسے اخباروں کی عام اشاعت محض برائے نام ہوتی تھی اور اُن کا کوئی تعلق رائے عامہ سے نہ ہوتا تھا لیکن سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد سے یہ رنگ بدل گیا اور ایسے صحیفہ نگاروں کی تعداد بہت کم ہو گئی اُن کے بجائے اب سیاسی ماحول نے ایسے اہل قلم پیدا کرنے شروع کئے جو "شجر ممنوعہ" کی طرف ہاتھ بڑھانے لگے بنگال میں سب سے پہلے یہ حرارت زیادہ پیدا ہوئی اور اس کے بعد پنجاب میں تقسیم بنگالہ کے ہنگامہ سے کچھ پہلے اور اس کے بعد اُردو صحافت اپنے قدیم مسلک سے جدا ہوئی اور اس نے مطالبۂ حقوق اور سیاسی تنقید کے ایک ایسے میدان میں قدم رکھا جہاں نئی آوازوں سے اُس کے کان اور نئے الفاظ سے اُس کا قلم آشنا ہوا اُس زمانہ کے بعض پرچے تو اس قدر گرم تھے کہ شاید آج بھی ان کے الفاظ کو دہرانا آسان نہیں خاک سے یہ آگ پیدا ہوئی اور آگ سے وہ شعلے بھڑکے جنھوں نے ملک کے لاکھوں آدمیوں کی ذہن فضا کو بدل دیا اور اعتدال پسند اور کمزور آباؤ اجداد کی یہ نئی اور محرور المزاج نسل جواب اپنے بلوغ کی طرف قدم اُٹھاتی جارہی ہے اور یسی ہمارہی ہے کہ

بامن مبادیزاے پدر فرزند اذر برانگر
ہرکس کہ شد صاحب نظر دریں بزرگاں خوش نکرد

قاضی عبدالغفار (اڈیٹر "پیام")

(نشورات لاسلکی)

لکھ داتا

"جگ جگ جیو، میرے لکھ داتا" کتنے پیارے الفاظ تھے۔ لیکن جس زبان سے یہ الفاظ نکلے، وہ ایک بدصورت نابینا انسان کی زبان تھی۔ اس کی آواز بھدی اور کرخت تھی۔ لیکن یہ الفاظ میرے کانوں کو کس قدر شیریں معلوم ہو رہے تھے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔

"جگ جگ جیو، میرے لکھ داتا" زندگی میں میرا کبھی لکھ داتا بن جانا ممکن تھا۔ یہ میں نے آج تک نہیں سوچا تھا لیکن ایک شخص مجھے لکھ داتا کہکر میری زندگی کے لئے دعائیں کر رہا تھا کتنی عجیب بات تھی۔

واقعی! عجیب بات تھی۔ یہی مال روڈ، یہی لاٹ صاحب کے بنگلہ کا موٹر، یہی پولیس گارد کا لمبا سپاہی، یہی موٹریں میں ان سب کو روز دیکھتا تھا لیکن آج کا رنگ کچھ اور تھا، مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا میں ہواؤں میں اُڑا جا رہا ہوں عام لوگوں سے بلند۔

ایک معمولی کلرک کی زندگی ایک مسلسل چکر ہے وہ ایک مشین کی طرح ہر صبح اُٹھکر نہاتا دھوتا ہے۔ ۹ بجے کھانا کھاتا ہے ایک ایسا کھانا جس میں حیاتین کی کم از کم مقدار ہو۔ اس کے بعد تمام دن فائلوں کے انبار میں دبا رہتا ہے۔ فائل کتنا دلچسپ لفظ ہے۔ لیکن جب اس پر سرخ یا سبز لیبل فوراً (Immediate) یا آج ہی (Put up To Day) لگ کر آ جائے تو روح کانپ اُٹھتی ہے۔

دفتری زندگی سے چار بجے کے بعد رہائی ملی۔ گھر آئے، ذرا دم لیا، سستائے، نہا دھوکر بنے ٹھنے اور زندگی کے اسٹیج پر ایک نیا پارٹ ادا کرنے کے لئے گھومنے نکل پڑے۔ یہ ہے مشین کا چکر ——— میری زندگی۔

آج میں مشین کی حرکت پوری کرنے کے لئے لارنس گارڈن کی طرف جا رہا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ لاٹ صاحب کے بنگلے کی نکڑ پر جاکر ایک نابینا لکڑی کے سہارے کھڑا دردناک لہجہ میں چلا چلا کر بھیک مانگ رہا تھا۔

"سرکار ان بھک منگوں کو گرفتار کیوں نہیں کر لیتی" ایک حسین لڑکی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ دونوں پاس سے گزر رہے تھے "وہ بولا، یہ واقعی ہمارے دیس کے لئے لعنت ہیں۔" اپنے نزدیک گویا بڑی فلسفیانہ بات کہی۔

پاس سے ایک موٹر تیزی سے گزری اور غبار اُڑاتی ہوئی غائب ہو گئی ——— حسین لڑکی ناک تک رومال بھی

نہ لیجا سکی۔ اس کا غازہ خراب ہوگیا۔ اسنے ناک چڑھائی اسکے ساتھی نے حقارت سے موٹر کی گرد کو دیکھا۔ بیچارا سوچتا ہوگا۔ کہ اگر اس کے پاس بھی موٹر ہوتا، تو وہ کیوں غبار آلود ہو جاتے ـــ موٹر کی آواز سن کر فقیر پھر زور زور سے چلّانے لگا۔ "پرماتما کے نام پر بابا۔ اندھے محتاج کو بابا ایک پیسہ ـــ آنکھیں بڑی نعمت ہیں بابا" لیکن موٹر نے جواب دیا اے اندھے، اور دھول آنکھوں میں ڈال لے، مجھے تم ایسے اندھوں کی کیا پروا ـــ ایک سائیکل سوار ـــ کسی کالج کا طالب علم معلوم ہوتا تھا ـــ سیٹی بجاتا ہوا گزرا۔ سائیکل کی آواز پر فقیر پھر چونکا اور چلّانے لگا۔ سائیکل موٹر کی طرح برق رفتار نہ سہی تیز رفتار تو تھی ہی۔ سیٹی کی مسلسل آواز فضا میں ایک نغمہ پیدا کرتی ہوئی لارنس گارڈن کے دروازے میں غائب ہوگئی ـــ سڑک پر ایک تانگہ آرہا تھا۔ اس میں ایک خانصاحب بیٹھے تھے، مونچھوں کا تاؤ ان کو اور بھی پر رعب بنا رہا تھا۔ اندھا پھر چلّایا ـــ لیکن غریب کی پکار کا جواب ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے ـــ قہقہہ۔

مجھ سے یہ نہ دیکھا گیا۔ میرے پاس صرف ایک پیسہ تھا۔ ایک پیسہ ـــ لیکن اس کی اہمیت میرے نزدیک بہت زیادہ تھی۔ لارنس گارڈن کے باہر بدررو کے پل پر ایک پنواڑی بیٹھتا ہے مجھے اس سے ایک پان خریدنا تھا تاکہ تکمیل آرائش ہو جائے ـــ ایک ایکٹر کی کامیابی کا انحصار اس کے رکھ رکھاؤ پر ہے اور اس کی ذرا سی خامی اداکار کو ناکام رکھتی ہے یہی حال میرا تھا، دو ایک سوٹ ہیں۔ وہ بھی کالج کے زمانے کی یادگار، جنھیں میں گھر ہی میں دھو کر ہر دوسرے تیسرے استری کر لیا کرتا ہوں اور لارنس گارڈن جانے کے لئے استعمال کرتا ہوں، پان کی ہلکی سی سرخی لبوں کو ذرا "دیدہ زیب" بنا دیتی ہے ـــ اب اندھے کی پکار ـــ اور میرے سوانگ کی تکمیل کا سوال تھا۔ میرا ہاتھ کئی بار جیب کی طرف گیا لیکن ہر بار ـــ فقیر کی آواز میرے دل کے اندر ڈوبی جا رہی تھی۔ شاید غریب کی آواز کا غریب پر زیادہ اثر ہوتا ہے یا غریب کا دل زیادہ کمزور ہوتا ہے ـــ میں مغلوب ہو ہی گیا۔ میں نے دل کڑا کر کے پیسہ فقیر کے ہاتھ پر رکھ دیا ـــ اپنی ساری پونجی دان کر دی ـــ "جگ جگ جیو، میرے لکھ داتا" اس کی آواز فضا میں گونج رہی تھی وہ بار بار کہ رہا تھا "جگ جگ جیو، میرے لکھ داتا" ـــ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا، گویا میں کسی اور دنیا میں ہوں ـــ موٹر کی شان، سائیکل سوار کی سیٹی، تانگہ پر جانے والے کی مونچھوں کا تاؤ، میری نگاہ میں سب ہیچ تھے ـــ فقیر کی آواز کی گونج سنکر حسین لڑکی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ گویا انھیں میرے دان دینے کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ تانگے والے مجھے حقارت سے تک رہے تھے شاید وہ سمجھتے تھے کہ سوٹ پہن کر ہر پیدل چلنے والے کی جیب خالی ہوتی ہے پنواڑی کی حسرت بھری نگاہ مجھ پر پڑ رہی تھی۔ کیونکہ اس کا ایک مستقل گاہک چھن گیا تھا ـــ اچانک اسوقت ایک چھکڑا لارنس باغ سے نکلا، اور مال روڈ کو پار کرتے ہوئے لاٹ صاحب کے بنگلے کے سامنے سے گزرا۔ چھکڑا اور موٹر ـــ میں نے دل میں موازنہ کیا ـــ تہذیب کی ساری داستان ـــ چھکڑا موٹر کی ابتدائی شکل ہے، فقیر اور امیر ـــ کیا یہ بھی ہندوستان کی تہذیب کی ساری داستان نہ تھی۔ خونی داستان صنعت کار تھا چھکڑے سے موٹر تیار کرتا ہے۔ لیکن دولت کا ارتقاء لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو فقیر اور محتاج کر دیتا ہے۔ چھکڑے

کی سست رفتاری موٹر کی برق رفتاری میں تبدیل ہوگئی۔ لیکن زر کی ہوس نے "جنت نشان" کو جہنم میں تبدیل کردیا۔ فقیر کو دیکھنا تک اب نازک طبائع پر ایک بارگراں ہے۔ اور سماج پر ایک دھبہ ـــ "لکھ داتا" میرا دماغ اس لفظ کے گرد گھوم رہا تھا، لکھ پتی ہونا بہت بڑی بات ہے، لیکن لکھ داتا ہونا ـ لاکھ روپیہ دان کرنا ـ یہ کتنی بڑی بات ہے، میں نے لاکھ روپیہ دان کردیا تھا۔ میری کل کائنات یہی ایک پیسہ تھی یہی میرے لئے لاکھ روپیہ تھا ـــ میں باغ کے اندر داخل ہوچکا تھا، اور حسب معمول "سکندر مونٹ" پر چڑھنے لگا، آج میرا ہر قدم خود بخود بلندی کی طرف اُٹھ رہا تھا میرے کان منتظر تھے کہ میری طرح اور کوئی لکھ داتا اسے خیرات دے اور پکارے، کہ میرے لکھ داتا۔ لیکن میرے سوا اور کوئی لکھ داتا نہ بن سکا ـ میں نے ایک بنچ پر بیٹھتے ہوئے باغ کا جایزہ لیا، سبزہ زار، قسم قسم کے پھول، شیشے سے زیادہ شفاف سڑکیں، سامنے بینڈ بج رہا تھا ـ وسط باغ میں موٹروں کی قطاریں، کتنا پُرلطف سماں تھا۔ شام کا دھندلکا۔ شفق کی سُرخی خوشگوار موسم، ہر طرف ہریاول ہی ہریاول ـ لیکن میں نے سوچا یہاں آنے والوں میں سے ایک بھی میری طرح لکھ داتا نہ تھا، حالانکہ انکی موٹریں خریدی جاتی ہیں غریبوں کے لہو سے ـ ان کے سنٹ اور خوشبودار تیل حاصل کئے جاتے ہیں، مزدوروں اور کسانوں کے پسینے سے انکے بڑے بڑے بنگلے، قبریں ہیں، انہیں بے کس انسانوں کی جن سے جانوروں سے بھی زیادہ کام لیا جاتا ہے ـ مگر جب ان بے زبانوں میں سے کوئی قدرت کی ستم ظریفی کا شکار بن کر محتاج ہوجائے اور دست سوال دراز کرے ـ نہیں نہیں بلکہ اپنا حق مانگے، تو یہ قدرت کے چہیتے اسے حقارت سے دیکھ کر گزر جاتے ہیں انکی موٹریں اس پر زیادہ دھواں پھینکتی ہیں انکے ٹانگوں کے گھوڑے زور سے ہنہناتے ہیں ـ یہ قدرت کا قانون ہے ـ فقیر کی آواز ابھی تک میرے کانوں میں آرہی تھی، وہ چلا رہا تھا "بابا پرماتما کے نام پر ایک پیسہ ـ صبح سے بھوکا ہوں بابا ـ آنکھیں بڑی نعمت ہیں ـ" ـــ پرماتما کے نام پر ـ کیا پرماتما کوئی ایسی چیز ہے، جس کے نام پر صرف ایک پیسہ مانگا جاسکتا ہے، پرماتما یا خدا کا یہ تصور کس قدر غلط ہے خدا کو کتنا محدود کردیا گیا، اس کا نام صرف بھیک مانگنے کے لئے استعمال کیا جارہا ہے، لیکن پرماتما نے فقیر کو اندھا کیوں کردیا ـ مالی باغ کو آراستہ پیراستہ کررہا ہو ـ ہر طرف عجیب و غریب پھول دکھائی دیتے ہوں یکایک وہ چند پھولوں کو لیکر مسل دے تو اسے کیا کہیں گے ـ پرماتما نے ایسی مخلوق کو کیوں پیدا کیا، جو اس کے لئے خود باعث عار ہیں ـ اور پھر ان کا یوں سسک سسک کر زندگی کے دن کاٹنا خدا کی پناہ، اس کا جذبۂ رحم کہاں چلا جاتا ہے، جب ایک غریب آدمی بیمار پڑجاتا ہے، اور اس پر انحصار رکھنے والا ایک کنبہ فاقوں مرنے لگتا ہے ایک کی بیماری کئی اوروں کے لئے پیغام قضا بن جاتی ہے، وہ سوکھی روٹی کو ترستے ہیں، ان کے حلق خشک ہوکر ان میں کانٹے سے چبھنے لگتے ہیں، لیکن عین اسوقت انکے پاس کے عالی شان محل میں ایک انسان اپنے ہوس نفس کو پورا کرنے کے لئے دعوتیں دے رہا ہوتا ہے، اس کے کتے کو ایک وقت کا اتنا راشن ملجاتا ہے جو اسکے ہمسایہ کے ایک غریب کنبہ کے لئے کئی دن کافی ہوسکتا ہے

"بنارسی پان بابوجی" ـ ایک پنواڑی میرے سامنے کھڑا مجھ سے پوچھ رہا ہے ـ "نہیں" میں چونک اُٹھا ـــ پان ـــ میں آج پان بھی نہ کھاسکا اور ـــ فقیر اور میں ـــ ہم میں سے کون مالدار تھا ـــ جسے فقیر لکھ داتا بتا رہا تھا ـ وہ اب ایک پیسہ کے لئے محتاج تھا اور فقیر ایک پیسہ کا مالک تھا ـ کیا امارت اور فقیری محض اضافی چیز نہیں ؟

(داستان) شبیر محمد اختر

اُس لڑائی کے بعد اور اس لڑائی سے پہلے

(مسلسل)

زیکوسلیوکیا کا قبضہ

مسٹر چمبرلین کی کوشش یا کمزوری سے معاہدۂ میونک (Munich) تو ہو گیا، لیکن ہٹلر ہنوز مطمئن نہ تھا۔ وہ بغیر لڑے ہوئے بڑی فتح حاصل کر چکا تھا، لیکن وہ اب بھی بے چین تھا اور لڑنے کے لئے بیتاب۔ چنانچہ اس نے شکایت شروع کی کہ جب تک موریویا (Moravia) پر اسکا قبضہ ہو میونک کا فیصلہ بیکار ہے، ادھر تو اس نے ۱۴؍ مارچ ۳۹ء کو برطانیہ اور فرانس کے سفیروں کو جو برلن میں متعین تھے یہ اطلاع دی کہ وہ کوئی اقدام کرنا نہیں چاہتا اور ساتھ ہی ساتھ زیکوسلیوکیا کے ضعیف پریسیڈنٹ ہاشا (Hasha) اور وہاں کے وزیر خارجہ کو برلن آنے کی دعوت دی۔

جب یہ برلن پہونچے تو بڑے احترام کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا گیا اور ہٹلر کے حضور میں لائے گئے۔ اسوقت ربن ٹراپ، گوئرنگ اور کیٹلر بھی موجود تھے اور میز پر وہ کاغذ بھی رکھا ہوا تھا جس پر دستخط ہونا تھے۔

ہٹلر نے ان سے کہا کہ "اب گفت و شنید کا وقت ختم ہو گیا ہے اور میں نے آپ دونوں کو اس لئے بلایا ہے کہ اپنا فیصلہ سُنا دوں اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ کل صبح ۹ بجے پراگ پر قبضہ کر لیا جائے گا، اور بوہیمیا و موریویا، رائش کی حفاظت میں لے لئے جائیں گے۔ اگر اس کی مخالفت کی گئی تو میں مخالفین کو روند ڈالوں گا"

ہٹلر نے یہ کہکر معاہدہ پر دستخط کئے اور کمرہ سے باہر چلا گیا۔ اس وقت رات کے سوا بارہ بجے تھے۔ ہٹلر کے چلے جانے کے بعد اُن دونوں نے سخت احتجاج کیا اور دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ ربن ٹراپ اور گوئرنگ ان دونوں کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے اور یہ میز کے چاروں طرف بھاگتے پھرتے تھے۔ ربن ٹراپ نے کہا کہ اگر تم نے دستخط نہ کئے تو ٹھیک صبح ۶ بجے ہوائی حملہ شروع ہو جائے گا اور دو گھنٹے کے اندر پراگ خاک سیاہ کر دیا جائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ پریسیڈنٹ ہاشا (Hacha) کو غش پر غش پڑنے لگے اور ہر بار ڈاکٹر کو بلا کر انجکشن کے ذریعہ سے اس کے حواس درست کئے گئے، یہاں تک کہ صبح ساڑھے چار بجے اس نے انتہائی جبر و اکراہ کے بعد معاہدہ پر دستخط کر دئے۔ صبح کو جرمن فوجیں بغیر کسی مزاحمت کے داخل ہو کر تمام ملک میں پھیل گئیں اور ان کے پیچھے پیچھے ہٹلر بھی اپنی گسٹاپو کی جمعیت لیکر پہونچ گیا۔

۲۴ر مارچ کے ٹائمس نے اس واقعہ پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا کہ "جرمنی نے بوہیمیا اور موریویا کی فوجوں کو غیر مسلح کرکے ۳۶ ڈویژنوں کے بہترین اسلحہ وسامان جنگ، آہن پوش موٹروں اور بھاری توپخانوں پر قبضہ پالیا اور یہ تمام سامان اتنا مکمل و بہتر تھا کہ خود جرمن افواج کو بھی میسر نہ تھا۔ اس قبضہ سے جرمنی کے بھاری توپوں کی تعداد دوچند ہوگئی۔ زیکوسلیویکیا کے پاس ۱۰۰۰ ہوائی جہاز تھے، جن میں سے ۵۰۰ بہترین قسم کے تھے، یہ بھی جرمنی کے ہاتھ آگئے، لیکن ان سے زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ دُنیا کی سب سے بڑے، تین کارخانے اسلحہ سازی کے (جو اپنی بہترین مشینری کے لئے مشہور تھے) اسکے ہاتھ آئے"۔

۸ رمئی کو ڈیلی ٹیلی گراف نے لکھا کہ "زیک فوج سے جو سامان جرمنی کے ہاتھ آیا اس کی قیمت ۳۰۰ ملین پونڈ سے زیادہ ہوتی ہے، جو سب کا سب جرمنی بھیجدیا گیا۔ اس سامان میں لاکھوں رائفلیں، ہزاروں مشین گنیں، ٹینک شکن توپیں، آہن پوش موٹر، طیارہ شکن توپیں اور ۲۰ کرور کارتوس شامل تھے اور اب زیک کے تمام کارخانے جرمن فوجوں کے لئے ہتھیار طیار کر رہے ہیں"۔

ان تمام واقعات پر ۱۵ر مارچ کو مسٹر چیمبرلین نے دارالعوام میں اظہار رائے کرتے ہوئے کہا کہ "میں عہد شکنی کا کوئی الزام جرمنی پر قایم کرنا نہیں چاہتا، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جو کچھ ہوا ہے، وہ معاہدۂ میونک پر دستخط کرنے والوں کے ذہن وخیال میں بھی نہ تھا"۔

مسٹر چیمبرلین کی اس ٹھنڈی تقریر کا اثر بہت خراب ہوا اور لوگوں نے ان سے کہا کہ خدا کے لئے کچھ تو گرمی دکھایئے اور انھوں نے اپنی بعد کی تقریروں میں کچھ تیزی سے کام لیا بھی، لیکن سب بیکار تھا، کیونکہ اُدھر ہٹلر برابر آگے بڑھتا جارہا تھا۔ چنانچہ اس نے ۲۱ر مارچ کو میمل پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس قبضہ کی داستان بھی ویسی ہی ہے جیسی زیکوسلیویکیا کی آپ نے سُنی۔ یعنی لتھونیا کے وزیر خارجہ کو برلن بلایا گیا اور ربن ٹراپ نے اس سے کہا کہ اگر میمل فوراً حوالے نہ کیا گیا تو لتھونیا کے پایۂ تخت کناس (Kaunas) پر ہوائی تاخت کرکے برباد کردیا جائے گا۔

پولینڈ پر حملہ کی طیاریاں

اسی تاریخ کو ربن ٹراپ نے پولینڈ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ روس پر حملہ کرنے میں جرمنی کا ساتھ دے، لیکن اس نے انکار کردیا۔ گزشتہ چھ مہینے کے اندر یہ تجویز تیسری بار پولینڈ کے سامنے پیش کی گئی لیکن اس نے پھر رد کردیا۔ اور اس کے بعد ہٹلر نے فیصلہ کیا کہ اگر پولینڈ اسپر راضی نہیں ہوتا تو کیوں نہ اسی پر حملہ کیا جائے اور روس سے تقسیم پولینڈ کی بات چیت شروع کردی۔

اخیر مارچ تک مرحلۂ پولینڈ کا خطرہ اس قدر قریب ہوگیا کہ ۳۱ر مارچ کو برطانوی حکومت نے پولینڈ کی حفاظت کا اعلان کردیا اور پانچ مہینے کے لئے جرمنی نے اپنا حملہ ملتوی کردیا، لیکن اس پانچ مہینے کے اندر برطانوی حکومت نے کیا کیا؟ اسکا بیان برطانوی پالیسی کی کمزوری اور نااہلیت کی نہایت دردناک داستان ہے۔

جب برطانیہ نے پولینڈ کی حفاظت ومدد کا اعلان کردیا تو یہاں کا وزیر مالیات لندن آیا کہ اسلحہ حاصل کرکے اپنی

فوج کو مضبوط کرے، لیکن اس کو یہ جواب دیا گیا کہ "ہمیں خود اسلحہ کی ضرورت ہے اور ہم انھیں فروخت نہیں کر سکتے"۔
اس کے بعد پولینڈ نے ہوائی طاقت بڑھانے کے لئے امریکہ سے قرض طلب کیا، لیکن اس نے بھی انکار کر دیا۔ اسکے بعد جنرل آئرن سائیڈ (Iron Side) وارسا (پولینڈ کے پایۂ تخت) گئے۔ یہ اپنے ساتھ بہت مختصر سا اسٹاف لے گئے تاکہ وہاں کے مارشل اسمگلی ریڈن (Smigly-Rydz) سے مدافعت کے متعلق گفتگو کریں۔ لیکن مارشل نے اس تجویز کو پسند نہیں کیا کہ خندق کھود کر مدافعت کی جائے کیونکہ وہ جرمنی کے خلاف جارحانہ کارروائی کا موافق تھا۔
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی بات طے نہ ہو سکی۔

۲۵ اگست کو انگلستان اور پولینڈ کے درمیان ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے، جس کی پہلی شرط یہ تھی کہ اگر ان دونوں سلطنتوں میں سے کسی پر یورپین سلطنت نے حملہ کیا تو دوسری سلطنت ہر طرح اس کی امداد کرے گی اور یہ مدد بری، بحری، ہوائی، ہر طرح کی ہوگی لیکن افسوس ہے کہ اس پر عمل نہ ہو سکا۔

جب برطانیہ نے پولینڈ کی حفاظت و امداد کا اعلان کیا تو ہٹلر نے ۲۶ جنوری ۱۹۳۴ء کے اس معاہدہ کو کالعدم کر دیا جو پولینڈ و جرمنی کے درمیان ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کے متعلق ہوا تھا۔

ڈینزگ کے مطالبہ پر برطانیہ کے امن پسند طبقہ کی رائے یہ تھی کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں جس پر لڑائی مول لیجائے۔ حالانکہ سچ پوچھئے تو معاملہ صرف ڈینزگ کا نہ تھا بلکہ سارے پولینڈ کا تھا، کیونکہ اگست میں جرمن اخباروں سے اس کی وضاحت پوری طرح ہو چکی تھی۔

اخیر اگست میں برطانیہ اور پولینڈ کے سفیروں نے جو برلن میں متعین تھے، یہ گفتگو شروع کی کہ پولینڈ کی جرمن اقلیت اور جرمنی کی پولش اقلیت کے درمیان تبادلہ ہو جائے، یعنی یہ آبادی وہاں چلی جائے اور وہ یہاں، لیکن ہٹلر نے اس پر کوئی توجہ نہیں کی، کیونکہ وہ تو لڑائی پر تلا ہوا تھا اور پہلی ستمبر ۱۹۳۹ء کی صبح کو اس نے پولینڈ پر حملہ کر ہی دیا۔

اس حملہ کے ۵۴ گھنٹوں کے بعد ۳ ستمبر ۱۱ بجے دن کو برطانیہ نے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

برطانیہ کی غلطیاں

برطانیہ نے پولینڈ کی حمایت میں اعلان جنگ تو کر دیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ اس لڑائی کی نوبت کیوں آئی اور اس نے کتنے اچھے موقعوں کو ہاتھ سے جانے دیا۔

ستمبر ۱۹۳۸ء میں معاہدۂ میونک سے پہلے مسٹر ڈالٹن نے ایک انگریز ماہر سیاسیات سے گفتگو کی تو اس نے کہا کہ لڑائی روکنے کی فکر کرنا اب بالکل بیکار ہے، ہٹلر لڑائی کا فیصلہ کر چکا ہے اور سوال اب صرف کہاں اور کب کا ہے۔ اسنے صاف صاف یہ بھی ظاہر کیا کہ اگر لڑائی ہوئی جو بالکل یقینی بات ہے تو اس کی ذمہ داری فرانس و برطانیہ کی کمزور پالیسی پر عاید ہوگی۔

سب سے پہلا موقع جسے برطانیہ نے کھویا، مارچ ۱۹۳۳ء کا تھا اسکو اسی وقت صاف صاف کہدینا چاہئے تھا کہ

اگر ہٹلر کو جرمنی کا چانسلر مقرر کیا گیا تو ہم کوئی سیاسی تعلقات نہ رکھیں گے۔ اُسوقت ہٹلر کا اقتدار اس قدر ضعیف تھا کہ آسانی سے اسے دور کیا جاسکتا تھا اور شلیشر (Schleicher) کو اس کی جگہ مل سکتی تھی، لیکن ایسا نہ کیا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اسٹر آسیر کو جو نازی حکومت کا سکرٹری تھا صرف اس لئے علحدہ کر دیا گیا کہ وہ شلیشر کا طرفدار تھا اور بعد کو جون ۳۴ء میں شلیشر کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔

اس کے بعد دوسرا موقعہ وہ تھا جب ۳۳ء میں ہٹلر نے جمعیت اقوام اور غیر مسلح کرنے والی کانفرنس سے علحدگی اختیار کی تھی، پھر تیسرا موقعہ وہ تھا جب اس نے معاہدہ کے خلاف ۳۵ء میں جبریہ فوجی بھرتی شروع کی لیکن ان موقعوں سے بھی فایدہ نہ اُٹھایا گیا۔

اس کے بعد جب ۳۶ء میں اس نے رہائن لینڈ پر قبضہ کیا اس وقت کہدینا چاہئے تھا کہ اپنی فوجیں واپس لے جاؤ کیونکہ یہ بھی معاہدہ کے خلاف کیا گیا تھا، لیکن بالکل خاموشی اختیار کی گئی۔ اگر اس وقت فرانس و برطانیہ دونوں اپنی فوجیں بھیجدیتے تو ہٹلر کو اپنی فوجیں واپس لیجانا پڑتیں

اس کے بعد جب مارچ ۳۸ء میں آسٹریا کے اندر اس کی فوجیں داخل ہوئیں اس وقت روکنا چاہئے تھا اور روس کی اس تجویز کو مان لینا چاہئے تھا جو اس نے یوروپ میں امن قایم رکھنے کے متعلق ایک بلاک بنانے کے لئے پیش کی تھی، لیکن آسٹریا میں نازی اقدام کو بھی گوارا کیا گیا اور آیندہ کے لئے روس کی مفید تجویز پر بھی توجہ نہ کی گئی۔

آسٹریا کے بعد اسنے زیکوسلیویکیا پر دانت لگائے تو اس وقت برطانیہ و فرانس کو پوری قوت کے ساتھ کہدینا چاہئے تھا کہ "خبردار، آگے نہ بڑھنا" لیکن اسوقت بھی کمزوری دکھائی گئی۔ الغرض ۳۳ء سے لیکر ۳۹ء تک مسلسل غلطیاں کی گئیں اور انھیں غلطیوں کا نتیجہ موجودہ جنگ ہے۔

اگر ۳۴ء میں آسٹریسا (Stresa) کانفرنس میں مسولینی کی تجویز پر عمل کرکے وسط یوروپ کے معاملہ کو طے کیا جاتا تو آج اٹلی برطانیہ کے ساتھ ہوتا، اسی طرح اگر ہٹلر کے ابتدائی عروج کے وقت رھائن لینڈ کے معاملہ میں فرانس و برطانیہ مضبوط ارادہ سے کام لیتے تو پولینڈ ان کا ساتھ دیتا۔

ان دونوں موقعوں پر پولینڈ نے یہی زور دیا کہ ہٹلر کے اقدامات کو روکا جائے، لیکن جب فرانس نے برطانیہ سے مشورہ لیا تو یہاں "دانشمندانہ سکوت" اور امن پسند خاموشی سے کام لیا گیا۔ اسوقت پولینڈ اتنا مضبوط تھا کہ تنہا جرمنی کے مقابلہ میں آسکتا تھا، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب ۳۳ء میں پولینڈ کے مارشل پل سوڈسکی (Pilsudski) نے اپنا نمایندہ ہٹلر کے پاس بھیجکر دریافت کیا کہ وہ کیا چاہتا ہے، لڑائی یا صلح، تو ہٹلر نے جواب دیا کہ میں تو صلح چاہتا ہوں اور جنوری ۳۴ء میں دس سال کے لئے پولینڈ کے ساتھ صلح کا معاہدہ کرلیا۔

۳۳ء تک برطانیہ کے ماہرین جنگ کی رائے یہی تھی کہ تنہا پولینڈ جرمنی کو شکست دے سکتا ہے، لیکن جب

چھ سال گزرنے کے بعد ہٹلر نے پوری فوجی طیاری کر لی تو جرمنی کا پلہ بھاری ہو گیا اور زیکوسلیوکیا پر قابض ہونے کے بعد تو ہٹلر کی قوت اتنی بڑھ گئی اور پولینڈ چاروں طرف سے اس طرح گھر گیا کہ تنہا پولینڈ اس کے مقابلہ میں کسی طرح آ ہی نہ سکتا تھا۔

روس کے معاملہ میں برطانیہ کی پالیسی اور زیادہ غلط تھی۔ اس کی تفصیل زیادہ دلچسپ ہے۔

۱۹۱۷ء سے روسیوں کو اُن کے لیڈر یقین دلاتے چلے آ رہے تھے کہ دنیا کی تمام سرمایہ دار حکومتیں اُن کی تباہی کی فکریں کر رہی ہیں، اس لئے وہ سب کو بہت مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس میں جتنی صحت بھی ہو ہمیں اس سے بحث نہیں، لیکن یہ یقینی ہے کہ فرانس و برطانیہ روس کے فتنہ کو مشرق ہی کی طرف رکھنا چاہتے تھے اور مغرب کی جانب اس کے بڑھنے کو پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ روس نے بھی اپنی جگہ یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر ہٹلر، فرانس و برطانیہ سے لڑنا چاہتا ہے تو لڑے ہمیں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔

روس ستمبر ۱۹۳۴ء میں مجلس اقوام کا ممبر ہوا تھا اور اس کا نمائندہ "Maxim Litvinov" برابر ساڑھے چار سال تک کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح ایک دوسرے کے خلاف حملہ کرنے کا امکان جاتا رہے، لیکن اس کی تجویزوں پر کبھی غور نہ کیا گیا۔ پھر چونکہ وہ اسٹالین کے خلوتیانِ راز میں شامل نہ تھا بلکہ صرف ایک ماہر سیاست داں کی حیثیت سے مجلس اقوام کا نمائندہ مقرر کیا گیا تھا اس لئے یقیناً اسے بڑی دشواری ہوئی ہو گی جب اسٹالین کو اسے سمجھانا پڑا ہو گا کہ وہ قوتیں جن سے ملجانے کا مشورہ وہ روس کو دیتا رہا تھا ہٹلر کے سامنے رھائن لینڈ میں، مسولینی کے سامنے حبشہ میں اور جاپان کے سامنے چین میں کیوں جھک گئیں۔

جب مارچ ۱۹۳۸ء میں ہٹلر نے ویانا پر دھاوا بولا تو لٹوینوف نے تجویز پیش کی کہ ایک کانفرنس صلح پسند حکومتوں کے فوراً طلب کرنا چاہئے تاکہ اس قسم کے اقدامات کا اعادہ نہ ہو سکے، لیکن برطانوی حکومت نے انکار کر دیا اور اس انکار کا روس کی حکومت پر بڑا خراب اثر پڑا۔ پھر یہ بات اسی جگہ ختم نہیں ہو گئی، بلکہ بعد کو ۱۹۳۸ء میں جبکہ ہٹلر، سوڈٹن لینڈ کے معاملہ میں جھگڑا پیدا کر رہا تھا، اس وقت بھی روس کو نظر انداز کر دیا گیا اور میونک کانفرنس میں بھی روس کی شرکت اس لئے گوارا نہ کی گئی کہ ہٹلر اور مسولینی اسے منظور نہ کرتے۔ یہ ایسی توہین تھی جو یقیناً روس کو بہت ناگوار ہونا چاہئے تھی اور ہوئی۔ پھر لطف یہ کہ ۲۶ ستمبر کو برطانیہ کے دفتر خارجہ نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ اگر ہٹلر نے زیکوسلیوکیا پر حملہ کیا تو برطانیہ، فرانس اور روس تینوں اس کا مقابلہ کریں گے۔ حالانکہ روس سے اس باب میں کوئی مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔

میونک کانفرنس کے بعد اسٹالین نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ نہ اب مجلس اقوام سے کوئی تعلق رکھے گا نہ مغرب کی جمہوری حکومتوں سے، لیکن لٹوینوف نے پھر اسے راضی کر لیا۔

اس کے بعد مارچ ۱۹۳۹ء میں جب ہٹلر نے پراگ پر حملہ کیا اور رومانیا خطرہ میں پڑ گیا تو لٹوینوف نے پھر آخری کوشش کی صورت میں یہ تجویز پیش کی کہ بخارسٹ میں چھ سلطنتوں کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے تاکہ متفقہ طور پر نازی

اقدامات کا مقابلہ کیا جائے، لیکن اس تجویز کو بھی برطانیہ نے مسترد کر دیا وہ اس سے زیادہ زود اثر تدبیر چاہتا تھا۔

اس کے بعد فرانس، برطانیہ اور روس میں مسلسل پانچ مہینے تک گفتگو رہی، لیکن اس گفتگو کا کیا انداز تھا اور اس کا کیا نتیجہ ہوا، یہ داستان بھی سننے کے لایق ہے۔

برطانیہ نے چھ سلطنتوں کی کانفرنس کی تجویز رد کر کے چار سلطنتوں کے اتحاد کی تجویز پیش کی یعنی برطانیہ، فرانس پولینڈ اور روس یہ معاہدہ کریں کہ اگر جرمنی ان میں سے کسی پر حملہ کرے تو باقی تین سلطنتیں مشورہ کر کے کوئی قدم اُٹھائیں۔

روس نے ہر چند اس تجویز کو ناکافی قرار دیا، تاہم وہ اس میں شرکت کے لئے آمادہ ہو گیا، لیکن پولینڈ نے انکار کر دیا کیونکہ اس معاہدہ سے جرمنی کے اور زیادہ مشتعل ہو جانے کا اندیشہ تھا اور خود اس کی حفاظت کی کوئی قابل اعتماد ضمانت موجود نہ تھی۔

۳۱ مارچ کو جب یہ معلوم ہوا کہ جرمنی، پولینڈ پر حملہ کرنے ہی والا ہے، تو برطانیہ نے پولینڈ کی حفاظت کی ذمہ داری کا اعلان کر دیا اور روسی سفیر سے دریافت کیا گیا کہ کیا برطانیہ کا وزیر اعظم اس کا اعلان کر سکتا ہے کہ روسی حکومت بھی پولینڈ کی حفاظت میں برطانیہ و فرانس کا ساتھ دے گی، لیکن روسی سفیر نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور نہ دے سکتا تھا کیونکہ اسے کوئی ایسی ہدایت حاصل نہ تھی۔

حفاظت رومانیا کی گارنٹی

۱۳ اپریل ۱۹۳۹ء کو برطانیہ و فرانس نے رومانیا کی حفاظت کی گارنٹی کی اور اسی تاریخ میں یونان کی حفاظت و امداد کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ ہر چند یونان کی حفاظت کی ذمہ داری چند دن پہلے ہی طے ہو چکی تھی لیکن رومانیا کا مسئلہ ۱۳ اپریل کی صبح کو طے ہوا، اور اس تعویق کا سبب یہ تھا کہ مسٹر چمبرلین اس کے لئے طیار نہ تھے لیکن جب چاروں طرف سے دباؤ پڑا اور ڈیلاڈیئے (وزیر اعظم فرانس) نے کہا کہ اگر برطانیہ اس کے لئے طیار نہ ہوگا تو تنہا فرانس اس بار کو اپنے سر لے گا، اسوقت مجبور ہو کر مسٹر چمبرلین نے اسکا اعلان کیا۔ روس کو آخر وقت تک یقین تھا کہ برطانیہ یہ ذمہ داری اپنے سر نہ کرے گا۔

۱۵ اپریل کو برطانیہ نے روس سے کہا کہ پولینڈ اور رومانیا کے تحفظ کی ذمہ داری میں وہ بھی برطانیہ و فرانس کے ساتھ شریک ہو۔ ۱۷ اپریل کو روس نے جواب دیا کہ یہ تجویز ناکافی ہے، بلکہ بالٹک اور بحر اسود کی تمام چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے تحفظ کے لئے اتحاد ثلثہ قایم ہونا چاہئے۔

برطانیہ نے بائیس گھنٹے تک اس پر غور کیا اور ۹ مئی کو پھر وہی ۱۵ اپریل والی تجویز پیش کی۔ یہ وہ وقت تھا جب روسی سفیر لٹوونوف علحدہ ہو چکا تھا اور فرانسیسی سفیر متعینہ برلن بھی اپنے لئے خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ اس نے پیرس کو اطلاع دی کہ اگر ہم نے عجلت سے کام نہ لیا تو جرمنی اور روس کے درمیان معاہدۂ اتحاد ہو جائیگا۔

اب روس کی طرف سے مولوٹوف مامور ہوا تھا، کہا جاتا ہے کہ اس نے فرانس اور برطانیہ کے نمایندوں

کے مقابلہ میں زیادہ نخوت و غرور سے کام لیا اس لئے فضا میں تکدر پیدا ہوگیا اور گفتگو ناکام رہی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کشش دونوں طرف پائی جاتی تھی۔ برطانیہ یہ سمجھتا تھا کہ روس کو اس مشورہ میں شریک کرکے گویا اس پر احسان کیا گیا ہے، دوسری طرف روس یہ سوچ رہا تھا کہ اصل مال تو اس کے ہاتھ میں ہے پھر یہ کیوں قیمت کم لگا رہے ہیں۔

الغرض یہ کھیل اسی طرح جاری رہا اور ۱۴ مئی کو روس نے جواب میں پھر وہی تجویز پیش کی جو ۱۸ اپریل کو اس نے پیش کی تھی۔ برطانیہ نے دو ہفتہ تک غور کیا اور کچھ اور تجویزیں ۲۷ مئی کو روانہ کیں جن کا جواب ۲ مئی کو روس نے دیا۔

حالات کا اقتضا اس وقت یہ تھا کہ کسی برطانوی وزیر کا فوراً ماسکو پہونچنا اور مولوٹوف سے صاف صاف گفتگو کرنا ضروری تھا اور لارڈ ہیلی فیکس کا نام پیش بھی کیا گیا، لیکن مسٹر چیمبرلین نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور برطانوی سفیر کی مدد کے لئے دفتر خارجہ کے ایک عہدہ دار مسٹر ولیم اسٹرینگ کو بھیجدیا۔

یہ ۱۵ جون کو ماسکو پہونچا لیکن مولوٹوف نے اس سے ملنے کے بعد کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ برا مانا کیونکہ نیم سرکاری طریقہ سے لارڈ ہیلی فاکس کو آنے کی دعوت دی گئی تھی اور وہاں سے دوسرے درجہ کا آدمی بھیجدیا گیا۔

نصف جون سے نصف اگست تک یہ سیاسی گفتگو جاری رہی، لیکن چونکہ برطانوی نمائندوں کو کوئی اختیار فیصلہ کا نہ دیا گیا تھا اس لئے وہ ہر بات میں وزیر اعظم برطانیہ سے ہدایت چاہتے تھے اور وزیر اعظم پارلیمنٹ میں پیش کرکے جواب دیتا تھا، اس لئے ایک ایک بات کے طے ہونے میں بہت دیر ہو رہی تھی۔ وسط اگست تک یہ سیاسی گفتگو، اسٹاف کی گفتگو میں تبدیل ہوگئی، یعنی اصولاً تو عہدنامہ طے ہوگیا لیکن اس کے الفاظ پر بحث و اختلاف شروع ہوا۔

اس پر مولوٹوف نے یہ تجویز پیش کی کہ برطانیہ و فرانس کو اپنے اپنے فوجی ماہرین اس گفتگو میں شریک ہونے کے لئے بھیجنا چاہئے، کیونکہ جب تک فوجی حیثیت سے گفتگو نہ ہوگی، روس معاہدہ پر دستخط نہ کرے گا۔

اس پر فرانس و برطانیہ میں کچھ شبہات کئے گئے تاہم موقعہ کی نزاکت اور جرمنی کی طیاریوں کو دیکھتے ہوئے برطانیہ، اور فرانس کا فوجی مشن ماسکو روانہ کیا گیا۔ لیکن اس مشن میں دوسرے درجہ کے افسر شامل تھے اور بجائے اسکے کہ ہوائی جہاز پر سوار ہوکر جلد پہونچ جاتے، معمولی بحری جہاز کے ذریعہ سے سفر اختیار کیا گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے پانچ دن انکو ماسکو پہونچنے میں لگ گئے۔

جب یہ مشن پہونچا تو روسی حکومت نے کہا کہ "ہم تو گیملین اور گورٹ کے آنے کی توقع کر رہے تھے۔ لیکن انکی جگہ وہ افسر بھیجے گئے ہیں جن سے برابر کی حیثیت سے گفتگو نہیں ہو سکتی"۔

چونکہ اس درمیان میں روس خفیہ طور پر جرمنی سے بھی گفتگو کر رہا تھا، اس لئے وہ بہانے پیدا کرکے اتحادیوں کے ساتھ گفتگو کو منقطع کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن خیر گفتگو شروع ہوئی۔ جب روسی نمائندہ سے پوچھا گیا کہ حملہ جرمنی کے وقت روس کیا اور کس طرح مدد دے گا تو اس نے جواب دیا کہ سرخ افواج پولینڈ میں بڑھکر جرمن افواج کا مقابلہ کریں گی، لیکن پولینڈ

نے اس کو منظور نہیں کیا اور ۲۰ راگست کو روسی نمایندہ خفا ہو کر چلا گیا۔ اس کے بعد برابر دو دن تک پولینڈ پر زور دیا گیا کہ وہ اس کو منظور کرے اور اس نے آخر کار منظور بھی کر لیا، لیکن جب اس کی اطلاع مولوٹوف کو دی گئی تو اس نے ہنسکر کہا کہ اب اس کا وقت ختم ہو گیا کیونکہ آج ربن ٹراپ آ رہا ہے اور ہم جرمنی سے معاہدہ کر رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ روس نے دھوکا دیا لیکن اس نے دیکھا کہ جرمنی کا ساتھ دینے میں اس کو فایدہ ہی فایدہ ہے، اتحادیین کا ساتھ دیکر تو اسے لڑنا پڑتا لیکن جرمنی کا ساتھ دینے میں اسے کسی سے لڑنا نہیں تھا۔ علاوہ اس کے اتحادیین روس کے اس اتحاد کا معاوضہ کسی صورت سے بھی دینے کے لئے طیار نہ تھے اور جرمنی نے وعدہ کر لیا تھا کہ روس کے اثرات وسطِ یوروپ اور بالٹک ریاستوں میں گوارا کر لئے جائیں گے۔

علاوہ اس کے ایک بات اور بھی ہوئی۔ وہ یہ کہ جرمنی نے گفت و شنید کے لئے اپنے یہاں سے ربن ٹراپ ایسے شخص کو بھیجا اور برطانیہ نے معمولی آدمیوں کو، پھر یہ بھی ہوا کہ جرمنی نے وقت کی اہمیت کا اندازہ کر کے فوراً فیصلہ کر لینے کی کوشش کی اور برطانیہ نے عرصہ تک اسے لیت و لعل میں ٹالا۔

فرانسیسی سفیر برابر ۷ رمئی سے آگاہ کرتا چلا آ رہا تھا کہ روس و جرمن ملکر پولینڈ کی تقسیم کا فیصلہ کرنے ہی والے ہیں، لیکن فرانس و برطانیہ دونوں خواب غفلت میں پڑے رہے اور کوئی کوشش روس کو اپنے ساتھ ملانے کی نہ کی حالانکہ اگر روس و جرمنی کے درمیان معاہدہ نہ ہو جاتا تو کبھی پولینڈ پر حملہ نہ ہوتا۔ کیونکہ جرمنی کے تمام فوجی افسران روس سے سمجھوتا کئے بغیر اس حملہ کے خلاف تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ فرانس و برطانیہ نے موقعہ سے فایدہ نہ اُٹھایا اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا ظاہر ہے۔

طلسمِ عمل

اُردو زبان میں پہلی کتاب جس میں "نفسیات" کے اس راز کو کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ ایک انسان کیونکر کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے۔ یہ ترجمہ ہے مسٹر ڈیل کارنیگی کی اس مشہور کتاب کا جو شایع ہوتے ہی لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو گئی۔ ترجمہ اس قدر سلیس و سادہ ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ مصنف نے اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعہ سے نفسیاتی حقایق کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ایک افسانہ کی دلچسپی اس میں پیدا ہو گئی ہے۔ کتاب کو ایکبار شروع کر نا اسے ختم کر دینا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ آٹھ آنہ (۱۸؍)

منیجر نگار لکھنؤ

نگار کا نظیر نمبر

اور

اختر تلہری کے ارشادات!

ابھی ایک مہربان دوست نے مارچ کے "جامعہ" کی طرف مجھے متوجہ کیا اور جناب سید اختر علی نے نگار کے نظیر نمبر پر جو فاضلانہ تبصرہ حوالۂ قلم فرمایا ہے اس کو مجھے پڑھنا پڑا۔ فاضل تبصرہ نگار کی نظر التفات سالنامہ نگار کے تین اراکین پر خصوصیت کے ساتھ پڑی ہے جن میں خوش نصیبی سے ایک میں بھی ہوں، اگر یہی ہوتا کہ دائرہ سخن صرف چند افراد تک محدود ہوتا تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ میں خواہ مخواہ اس پر خامہ فرسائی کرنے اسوقت بیٹھ جاتا۔ سمجھ لیتا کہ میرا مضمون اور میرے ساتھ کم و بیش بعض اور کے مضامین موصوف کے دل یا دماغ میں بیٹھ نہ سکے۔ لیکن موصوف نے افراد سے ہٹ کر ایک خاص زعم ورک بصیرت کے ساتھ چند تنقیدی کلیات اور ادبی مفروضات سے بھی بحث کی ہے جن کو پڑھنے کے بعد میں اپنی اس تحریک کو دبا نہیں سکتا کہ میں بھی کچھ عرض کروں۔

قبل اس کے کہ میں اُصول و کلیات کی طرف متوجہ ہوں فاضل مبصر نے میرے مضمون کے متعلق جس "ظن بلیغ" کا اظہار فرمایا ہے اس کی بابت کچھ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

میں اور میرے ساتھ تین اور حضرات نے "نظیر اکبرآبادی کی شاعری کے متعلق جو عنوان نظر اختیار کیا ہے" اس کے بارے میں سب سے پہلی بات جو کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ "اس پر بیشتر مارکس کے خیالات کی مہریں لگی ہوئی ہیں" اور یہ حکم آپ نے ایک خاص مفتیانہ لہجہ میں لگایا ہے بالکل اسی لہجہ میں جس لہجہ میں اب سے ایک نسل پہلے لوگوں پر کفر و الحاد کے الزام لگائے جاتے تھے گویا کسی خیال پر مارکس کی مہر ہونا ہی اس کے غلط یا ناپاک ہونے کی کافی دلیل ہے یہ اس خطرناک ذہنیت کی علامت ہے جو صرف یہ دیکھتی ہے کہ "کس نے کہا؟" اور یہ دیکھنا پسند نہیں کرتی کہ "کیا کہا؟"

میں نے نظیر پر جو مضمون لکھا ہے اس کا مقصد اس کے عنوان ہی میں ظاہر کر دیا گیا ہے اور مجھے اپنے عنوان اور اپنے موضوع کا شروع سے آخر تک خیال رہا ہے اور مقالات کی بابت میں کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن کم سے کم میرا مقصد ہرگز یہ

نہیں تھا کہ نظیر کو محض شاعر کی حیثیت سے پیش کروں۔ شاعر کا جو مفہوم ابتک سمجھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ شاعر ایک خاص دُنیا کی مخلوق ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ایک خاص تائیدِ غیبی ہوتی ہے اس کو اپنی اس برتری کا احساس ہوتا ہے، اور وہ جو بات کہتا ہے ایک خاص مقام سے ہوتی ہے۔ جس کو عوام نہ کہہ سکتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔

شاعر کی یہ تعریف نظیر پر صادق نہیں آتی اور شاعری کے اسی تصور سے نظیر نے ارادی یا اضطراری طور پر انحراف کیا۔ میں نے نظیر کی اسی حیثیت پر زور دیا ہے۔ میں نے کہیں ان پر خالص جمالیاتی نظر نہیں ڈالی ہے کہ ان کے فنی نقائص کا بھی خواہ مخواہ ذکر کرتا۔ یہ تو نظیر کی بہت سطحی خصوصیات تھیں جو میرے دائرۂ موضوع سے یک قلم باہر تھیں اور جن کو ہر شخص ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ میں دیکھ سکتا ہے۔ اگرچہ میرا خیال ہے کہ نظیر کی یہ فنی بے پروائیاں بھی ان کے اسی عام میلان سے منسوب کی جاسکتی ہیں جسکو میں نے "جمہوریت" بتایا ہے بہرحال میں صرف نظیر کی اس حیثیت سے بحث کرنا چاہتا تھا جو ان کو اُردو شاعری کے تمام اساتذہ سے ممتاز کرتی ہے اور جس کو سماجی اور عمرانی واقعیت (Social + cultural Realism) کہتے ہیں اور میں نے اپنے مضمون میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا ہے کہ نظیر سے اُردو شاعری میں جمہوری واقعیت کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن میں نے ان کو واوین کے اندر "جمہوریت پسند اشتراکی" کہیں نہیں بتایا ہے جیسا کہ فاضل مضمون نگار نے مجھ پر الزام لگایا ہے "اشتراکیت" اور "جمہوریت" کے جدید مفہوم مارکس اور انگلز (اس نام کا تلفظ انگلز ہے اینجیلز نہیں ہے) کے اشتراکی اعلان (Communist manifesto) سے پہلے دُنیا ناواقف تھی اور اس کا عام چرچا تو اب ہمارے وقت میں ہونے لگا ہے۔ پھر مجھ کو یا جناب اختر تلہری کو یا کسی کو اس پر اصرار کیسے ہوسکتا ہے کہ نظیر کو آجکل کی "جمہوریت" یا "پرولتاری ادب" سے کوئی واسطہ ہوسکتا ہے؟ لیکن ایک اشتراکیت وہ بھی ہے جو انسانیت کی مترادف ہے اور ایک جمہوریت وہ بھی ہے جس کی کوئی تاریخ نہیں ہے نظیر کی اشتراکیت اور نظیر کی جمہوریت اسی قسم کی تھی۔ کسی اُستاد یا کسی نصاب نے ان کو اشتراکیت اور جمہوریت نہیں سکھائی تھی۔ وہ اپنے کو فطرتاً خدا کی وسیع دنیا اور انسان کی کثیر سے کثیر تعداد سے قریب اور مانوس پاتے تھے اور دونوں سے بے انتہا خوش تھے۔

اختر علی صاحب کا تنقیدی مراسلہ پڑھنے کے بعد جو مجموعی اثر مستقلاً رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایک عمر سے مارکس اور نظیر دونوں کی طرف سے بھرے بیٹھے تھے اور اپنے دل کا غبار نکالنے کے لئے بے چین تھے۔ مجھے امید ہے کہ یہ غبار اچھی طرح نکل چکا ہوگا۔ اور اب ان کے دل میں کچھ باقی نہ ہوگا۔ لہذا اب میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ خالی الذہن ہوکر اور ٹھنڈے کلیجے کے ساتھ چند باتوں پر غور فرمائیں اور وہ یہ ہیں:۔

(۱) ادب اور اس کی ایک صنف ہونے کی حیثیت سے شاعری زندگی کا ایک مرکب تجربہ ہے جس میں تمام اساسی تجربات خارجی اور باطنی شامل اور داخل ہیں۔

میتھو آرنلڈ نے جب ادب کو "تنقیدِ حیات" بتایا تھا تو ادب کی جو صنف اس کے ذہن میں سرِ فہرست تھی وہ شاعری تھی

معلوم ہوتا ہے کہ اختر علی صاحب میتھو آرنلڈ سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں یا ان کو اس کے اندر صحیح درک حاصل نہیں ہے میتھو آرنلڈ شاعری کو ادب کی اہم ترین صنف سمجھتا تھا اور جب کبھی "ادب" کا لفظ استعمال کرتا تھا تو شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے ذہن میں شاعری کا تصور ہوتا تھا اور وہ شاعری ہی پر جملہ اصناف ادب کا قیاس کرتا تھا لیکن ہم میتھو آرنلڈ کو درمیان میں کیوں لائیں؟ کیوں نہ خود ہی سوچیں کہ ادب کو ہماری واقعی زندگی سے کوئی واسطہ ہے یا نہیں؟ - اندازہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اختر علی صاحب بھی اس سوال کا جواب نفی میں دیتے ہوئے ہچکچائیں گے - میرے خیال میں ادب زندگی کی تخلیقی تنقید (Creative Criticism) ہے اور شاعری ادب ہی کی ایک صنف ہے اس کے اندر وہ نوعی خصوصیات جس قدر بھی ہوں جو اس کو اور اصناف سے ممتاز کرتی ہوں لیکن اس کے اندر وہ تمام خصوصیات تو ہونا ہی چاہئیں جو ادب میں پائی جاتی ہیں اس لئے کہ ادب شاعری کی جنس ہے اور منطقی شجرہ میں بھی جنس پہلے آتی ہے اور فصل بعد کو۔

(۲) میں نے کہیں نہیں کہا ہے اور نہ کوئی سمجھ بوجھ رکھنے والا شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ شعراء متقدمین کے "خیالات وافکار کے شاداب پھول" کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے اور "سبزۂ بیگانہ" کی طرح ان کو روند ڈالو - اختر علی صاحب سیاق عبارت کا مفہوم سمجھنے میں اپنے تخیل کو ضرورت سے زیادہ راہ دیدیتے ہیں انھوں نے شاید یہی ایک مضمون پڑھا ہے ورنہ ان کو میری بابت قطعی اور صریح حکم لگانے میں دیر لگتی - میں نے اکابر شعراء اردو کا مسلسل اور منضبط مطالعہ کیا ہے اور ایک پوری عمر اسی میں صرف کی ہے - اور میرا مطالعہ محض مجہولی یا تفریحی مطالعہ نہیں تھا - میں نے تنقید کے تقریباً تین سو صفحات صرف "اگلے وقتوں کے لوگوں" یعنی مشاہیر غزل اردو پر لکھے ہیں، اور ان کے اکتسابات شعری کے قدر و قیمت کو تسلیم کیا ہے لیکن مہذب اور سنجیدہ مذاق کا تقاضا ہے کہ چند تاریخی حقیقتوں کو تسلیم کر لیا جائے چاہے وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہوں، اور انھیں تاریخی حقیقتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہماری اب تک کی شاعری سامنتی نظام اور سامنتی ذہنیت (A Feudal mind) کی پیداوار رہی ہے اُس سامنتی نظام اور سامنتی ذہنیت کی جو ممالک مغربی سے تو مدت ہوئی رخصت ہو چکی لیکن ہندوستان میں ابتک باقی ہے۔

(۳) دنیا میں عام طور سے اور ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ ابتک ادب جس زندگی اور جس تہذیب کی نمائندگی کرتا رہا ہے وہ اقلیت کی تہذیب تھی - اختر علی صاحب کو کم سے کم یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ ہمارے ملک میں کتنے فیصدی پڑھے لکھے ہیں اور ان میں بھی کتنے ہیں جو میر اور غالب سے اثر قبول کر سکیں گے - میر اور غالب کے کمالات کا میں معترف ہوں لیکن یہ بھی احساس رکھتا ہوں کہ یہ کمالات ایک خاص سطح اور ایک خاص دائرہ تک محدود ہیں - انسان اور بالخصوص ایک ناقد کو اپنے یا اپنی محدود جماعت کے مذاق اور میلانات میں غلو نہ ہونا چاہئے۔

اس کے اندر ایک بے لاگ خارجیت (Disinterested Objectivity) ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنی

مخصوص و محدود رغبت و نفرت کے تنگ دائرہ سے باہر آکر اور اُن کے تعصب آفریں اثرات کو نظر انداز کر کے واقعات پر غور کر سکے اور ان پر حکم لگا سکے۔ ہمارے ادیبوں نے ہمارے لئے جو کچھ کیا اس کا اعتراف نہ کرنا یقیناً کفران نعمت ہے لیکن ان کی کوتاہیوں کو بھی ان کے اکتسابات میں شمار کرنا جہل ہے۔ اور اسوقت تک نہ صرف ہمارے ادب نے بلکہ دُنیا کے ادب نے جو کچھ کیا ہے وہ ایک مخصوص اور کم تعداد طبقہ کے لئے کیا ہے جس کو شریفوں کا طبقہ کہا جاتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اعلیٰ اور ادنیٰ۔ شریف اور رذیل۔ امیر اور غریب۔ خاص اور عام مختصر یہ کہ اقلیت اور اکثریت کے درمیان جو خلیج ہمارے سامنتی نظام اور مہاجنی نظام نے پیدا کر رکھی ہے اس کو اور زیادہ وسیع اور عمیق بنانے میں ہمارے ادب نے بھی کچھ کم مدد نہیں کی۔ ابتک کی تہذیب اور ابتک کے ادب نے ایک مخصوص اور کم تعداد جماعت کے لئے جو کچھ کیا اور اس کو جو کچھ دیا وہ اپنی جگہ مسلم ہے لیکن دونوں خلقتِ انسانی کی کثیر سے کثیر تعداد کے حقوق بھی غصب کئے رہے ہیں۔ تہذیب اور شائستگی۔ اخلاق اور ادب کا نام لے لے کر ڈاکے بھی ڈالے گئے، ورنہ آج یہ نہ ہوتا کہ میر اور غالب، حافظ اور نظیری، ورڈسورتھ اور شیلی کو ہم آپ تو پڑھ پڑھ کر جھومیں اور ایک خلق اللہ گنتری اور بیچارگی کا دردناک احساس لئے ہوئے ہمارا آپ کا منھ تکتی رہے اور پھر ہمیں آپ ان کو جاہل اور حقیر قرار دیں۔

(۴) نظیر اکبر آبادی بھی سامنتی دور اور سامنتی معاشرت کی مخلوق تھے لیکن بعض ہستیاں ہوتی ہیں جو اختیاری یا غیر اختیاری طور پر مروجہ مذاق اور مروجہ معیار سے منحرف ہو جاتی ہیں اور ماضی و حال سے زیادہ مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ نظیر کا بھی شمار ایسی ہی ہستیوں میں ہے۔ اُردو شاعری میں وہ بغاوت کی پہلی آواز ہیں۔ یہی میرے مضمون کا مرکزی خیال ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے اب سے کم و بیش سو سال پہلے اُردو شاعری میں اس جمہوریت اور اس واقعیت کی بنیاد ڈالی جس کی تعمیر اب ہو رہی ہے۔

(۵) اُردو شاعری میں چونکہ سب سے زیادہ رائج اور مقبول غزل رہی ہے اور غزل کو چونکہ روایتاً واردات قلبیہ اور کیفیات ذہنیہ کے لئے مخصوص سمجھا گیا ہے اس لئے اس میں داخلیت کا ایسا غلبہ ہوا کہ خارجی زندگی کے تمام تنوعات، زمین و آسمان کے سارے حادثات ہماری شاعری کے لئے حرف غلط ہو کر رہ گئے۔ اور شاعری میں جس زندگی کی نمایندگی ہوئی وہ پوری زندگی نہیں تھی بلکہ زندگی کا صرف ایک رُخ تھا اگر ہمارے شاعروں کے متعلق کہا جائے کہ ان کی آنکھیں اندر کی طرف کھلتی تھیں تو غلط نہ ہوگا۔

نظیر پہلے شاعر ہیں جس کی آنکھیں باہر کی طرف کھلیں اور جس کی کائنات شعری کی بنیاد صرف باطنی کیفیات پر نہیں رہی۔ میں نے اپنے مضمون کے آخر میں اس کو کافی واضح کر دینے کی کوشش کی ہے۔ نظیر کی نگاہ میں زندگی کی لامحدود وسعتیں تھیں اور وہ ان کا احترام کرتے تھے۔

(۶) اُردو زبان قصاید۔ مثنویات اور مراثی کے باوجود خارجی شاعری میں بہت مفلس اور کم حیثیت رہی ہے۔ میر حسن

کی مثنوی اور میر انیس کے مرثیوں سے پہلے تو خارجی شاعری کا محض نام تھا اور اس نام کی لاج رکھنے کے لئے ہم بھی کہدینگے کہ اُردو میں خارجی شاعری تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ نظیر اکبر آبادی سے تھوڑی دیر کے لئے قطع نظر کر لیجئے تو میر حسن اور میر انیس کے اُردو میں خارجی شاعری کا باضابطہ آغاز ہوتا ہے۔ میر حسن کی مثنوی واقعہ نگاری میں مصوری کا درجہ رکھتی ہے اور واقعیت کی پہلی کامیاب مثال ہے۔ لیکن اول تو اس میں زندگی کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اس میں خیالی اور فرضی عناصر کو بھی شامل کر دیا گیا ہے دوسرے میر حسن نے امرا اور روسا کی زندگی کو زندگی سمجھا اور جمہور کی زندگی سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ یہ ان پر کوئی الزام نہیں ہے۔ اب تک کی رسم یہی رہی ہے۔ میرا مطلب نظیر اور میر حسن کے درمیان جو فرق ہے اس کو واضح کرنا ہے۔ میر انیس کی ساری واقعہ نگاری واقعہ کربلا پر ختم ہوگئی۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے اہل عرب کی زندگی اُن کے عادات و اطوار اور رسوم و روایات کی جو تصویریں پیش کی ہیں ان میں ہندوستان کی ایک روبہ انحطاط معاشرت کے آثار اور زیادہ نمایاں ہیں اور فرات کا پانی گومتی کا پانی معلوم ہوتا ہے لیکن میر انیس کی نیت یہ نہ تھی یہ تو ان سے غیر شعوری طور پر ہو گیا۔

بہر حال میر انیس کی قوتِ بیان اور مصورانہ قدرتِ تحریر کا اعتراف کرتے ہوئے بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے یہاں زندگی کی عام اور اصلی تصویریں نہیں ہیں۔ ان کی واقعیت پھر بھی تخیلی واقعیت ہے۔ میں نے جب نظیر کی واقعہ نگاری کے سلسلہ میں یہ کہا تھا کہ ایسی مرقع نگاری میر حسن اور میر انیس کے بس کی بات نہیں تھی تو میری مراد اس اصلی اور جمہوری واقعیت سے تھی جس کی اہلیت سے یہ اساتذہ واقعی محروم تھے۔ اور جس کے ترکیبی عناصر میں "خوبصورت سمدھن" اور "کسبیاں" بھی شامل ہیں اگرچہ یہی سب کچھ نہیں ہیں۔ میرے لئے یہ بات بصیرت سے خالی نہیں کہ اختر علی صاحب کی نظر خوبصورت سمدھن کے بے پردہ اعضا" اور "کسبیوں کے ازار بند" ہی پر پڑی، اور نظیر کے کھینچے ہوئے اور مرقع ان کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے۔ یہ اپنا اپنا حسن نظر ہے۔ مگر یہ مرقع نگاری بھی نظیر کا ایک نمونہ کمال ہے اگرچہ جس وقت میں نے نظیر کے سلسلہ میں میر حسن اور میر انیس کے نام لئے تھے تو میرا یہ مطلب تھا کہ میر حسن اور میر انیس نہ صرف "خوبصورت سمدھن"، "کسبی"، "رقاصہ" جیسے عنوانات پر نظمیں لکھنے سے قاصر تھے بلکہ "بنجارہ نامہ"، "ہنس"، "آگرہ کی پیراکی"، "برسات"، "بڑھاپا"، "دیوالی"، "شب برات" کی بھی ایسی سچی تصویریں اتارنا ان کی قدرت سے باہر تھا۔

(۵) زبان اور اسلوب کی رو سے نظیر اور دوسرے شعراء اُردو کے درمیان جو فرق ہے اس کو میں غیر متعلق بحث سمجھتا ہوں اسی لئے میں اس کو درمیان میں نہیں لایا۔ ظاہر ہے کہ اُردو زبان اور اسلوب کو رچنے اور مہذب اور شائستہ بنانے میں میر۔ غالب، میر حسن اور میر انیس وغیرہ نے جو حصہ لیا نظیر نے نہیں لیا۔ اور مہذب اور شائستہ ادبی ذوق نظیر کی زبان اور اُن کے لب و لہجہ کو معیار سے گرا ہوا پاتا ہے۔ لیکن ہمارے ذوق کو ابھی اور مہذب اور شائستہ ہونا ہے اور اس کی احتیاط کرنا ہے کہ تہذیب اور شائستگی کے پردے میں حق تلفیاں نہ ہونے لگیں نظیر کی شاعری کے لئے میر حسن اور میر انیس یا غالب

اور مومن کی "مہذب" زبان اور ان کا رچا ہوا اسلوب یقیناً ناموزوں اور بے جوڑ ہوتا۔ نظیر کی شاعری موضوع، زبان اسلوب ہر لحاظ سے جمہور کی زندگی سے ماخوذ تھی اور اس اعتبار سے وہ بڑی پختگی اور استقامت کا پتہ دیتے ہیں۔ میں کہہ چکا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ جس چیز کو ہم نظیر کا ابتذال بتاتے آئے ہیں وہی ان کا فن ہے۔ نظیر نے اُردو شاعری میں ایک نیا میلان پیدا کیا اور اسکو ایک نیا معیار دیا جس کو مروجہ معیار نے سوقیت اور ابتذال سے تعبیر کیا مگر یہ دراصل دو عقیدوں اور دو معیاروں کا سوال ہے۔

یہاں تک تو نظیر سے بحث تھی۔ لیکن اختر علی صاحب نے ادب اور عمرانیت کے اُصول و کلیات سے بحث کرنے کی بھی کچھ کوشش کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھوں نے حیاتِ انسانی کا صحیح مطالعہ نہیں کیا ہے۔ ادب انسانی زندگی کے سنجیدہ حرکات میں سے ہے اور اسکی غایت صرف تفریح یا زندگی سے گریز نہیں ہے۔ اگرچہ یہ غرض بھی ایک صحت بخش حد تک اسکے اغراض میں شامل ہے۔ ادب کی غایت انسان کی زندگی کو بڑھانا، اسکی وسعتوں اور اسکے امکانات کو ترقی دینا ہے اس اعتبار سے ادب یقیناً ایک قسم کا پروپیگنڈا ہے اگرچہ ہر پروپیگنڈا ادب نہیں ہوتا۔

پھر چونکہ ادب انسان کی زندگی کی ایک حرکت ہے اس لئے اس پر زندگی کے تمام اسباب و محرکات کا اثر پڑنا ضروری ہے اور چونکہ ادب کا کام انسان کی زندگی سنوارنا اور اس کو بہتر سے بہتر بنانا ہے اس لئے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کے تمام اسباب و محرکات اور اسکے تمام میلانات و امکانات سے مربوط اور متعلق رہے۔ اقتصادیات و سیاسیات بھی زندگی کے اہم اسباب و محرکات میں سے ہیں۔ اور ادب ان میں سے کسی سے بیگانگی یا بے نیازی نہیں برت سکتا ادب سیاسیات یا اقتصادیات کا ڈھنڈھورا تو نہیں ہوتا لیکن سیاسی اور اقتصادی حالات و اسباب سے اثر قبول کئے ہوئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا اور پھر جب اسکی باری آتی ہے تو ادب ان حالات و اسباب کو بھی متاثر کر کے ہی رہتا ہے۔

میں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ یہ سچ ہے انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہ سکتا لیکن بغیر روٹی کے بھی وہ زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کی تاب نہیں لا سکتا۔ ہماری زندگی کے خارجی اور مادی حالات ہماری ذہنی زندگی پر کیا اثرات چھوڑتے ہیں؟ ہمکو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ لیکن احساس ہو یا نہ ہو واقعہ واقعہ ہوتا ہے شعر و ادب تو خیر درکنار ہمارے تمام عادات و اخلاق، ہمارے تمام حرکات و سکنات یہانتک کہ ہماری محبت اور ہماری عبادت کو بھی ہماری زندگی کے خارجی اسباب جن میں اقتصادیات سب سے زیادہ اہم ہے متاثر کر کے چھوڑتے ہیں "پراگندہ روزی پراگندہ دل" بہت پرانی مثل ہے۔ اور "خداوند نعمت بحق مشتغل" کسی اشتراکی کی اختراع نہیں ہے اور اشتراکیت اور انقلابیت کے وجود میں آنے سے بہت پہلے قحط سالی کی بدولت دمشق والے عشق بھول گئے تھے — پھر آپ ہی سوچئے۔ جب عشق اور عبادت جیسے نشے فاقہ میں ہرن ہو جاتے ہیں تو پھر ادب یا شاعری کا نشہ کس شمار قطار میں ہے؟ جیسی ہماری زندگی ہوتی ہے ویسا ہی ہمارا ادب ہوتا ہے۔ بھوکے آدمی کی شاعری۔ بھوکے آدمی کے عشق۔ بھوکے آدمی کی عبادت میں بھی بھوک کے آثار ہوں گے۔

میں اقتصادیات ہی کو ساری زندگی نہیں سمجھتا۔ یہ تو زندگی کی عمارت کا صرف ایک ستون ہے اور بہت سے عناصر اور بہت سی قوتیں زندگی میں کام کر رہی ہیں جو اتنی ہی اہم اور ناقابل تجاہل ہیں جتنی کہ اقتصادی قوتیں اور میں ان لوگوں کا ہم آواز نہیں جو بھوک کو انسان کی واحد ضرورت اور روٹی کو اسکی زندگی کا تنہا سبب بتاتے ہیں۔ ہماری بہت سی ضرورتیں ہیں اور ہماری زندگی کے بہت سے اسباب ہیں، لیکن میں اسکا قایل ہوں کہ ہمارا ادب ہماری سماجی اور معاشرتی زندگی سے برابر متاثر ہوتا رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زندگی کے ساتھ ادب بھی دور بدور اتنے ادب نہ بدل چکا ہوتا۔ آخر کیا سبب ہے کہ اس وقت نہ میر اور غالب کی شاعری کا رواج ہے نہ جرأت اور داغ کی؟ اسکا سبب صرف یہ ہے کہ ہماری سماجی اور اقتصادی زندگی کے ساتھ ہمارے ادب کا رُخ بھی بدل گیا ہے۔ زندگی ایک متحرک اور نامیاتی (Organic) کلی حقیقت ہے۔ جو ایک نقطہ پر بھی قایم نہیں رہ سکتی۔ وہ خود بدلتی رہتی ہے اور اس کے ساتھ اس کی ہر چیز بدلتی رہتی ہے ۔۔۔ میں مارکس کی طرح یہ کہنے کے لئے تیار نہیں کہ ادب ابتک زندگی کی صرف تاویلیں کرتا رہا ہے اور اُسنے زندگی کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ادب کو زندگی کی تخلیقی تنقید بتایا ہے۔ یعنی ادب کا کام یہ ہے کہ زندگی پر تنقید کر کے اسکو از سر نو پیدا کرے اور پہلے سے زیادہ خوبصورت اور مکمل بنائے یہ ہے ادب کی تخئیل۔ اور ادب نے اس تخئیل کی کسی نہ کسی حد تک تکمیل بھی کی۔ زندگی کی طرح ادب میں بھی اتنے دور ہو چکے اور ہر دور میں ادب نے نیا رنگ روپ اختیار کیا۔ یہ تاریخی حقیقت میرے دعوے کی دلیل ہے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ابتک ادب نے جو کچھ کیا ایک مخصوص اور منتخب اقلیت کے لئے کیا اور اعلیٰ اور ادنیٰ کے فرق کو نہ صرف قایم رکھا بلکہ اسکو زیادہ شدید بنایا۔ اب ادب بجا طور پر خواص پرستی کے جرم میں ماخوذ کیا جا رہا ہے اور اسکی رہائی اور آزادی کی صرف ایک یہ صورت ہے کہ وہ جمہوریت کے شرایط اور مطالبات کو منظور کرے۔ اسلئے کہ یہ انسانیت کے شرایط اور مطالبات ہیں۔ اختر علی صاحب کی طرح بہتیرے شایستہ اور مہذب ذوق رکھنے والے کہیں گے کہ یہ جمہوریت شرافت اور تہذیب میں بٹہ لگائیگی۔ اگر شرافت اور تہذیب کے یہ معنی ہیں کہ شریفوں اور مہذبوں کا بس ایک چھوٹا سا کوڑھی گھر بسا کر بیٹھ رہو تو یہ شرافت اور یہ تہذیب اب دنیا میں زیادہ عرصہ تک باقی رہنے والی نہیں اسلئے کہ اسکے مبروص اور جذامی ہونیکا راز کھل چکا ہے۔ اور دنیا جان چکی ہے کہ اسکے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ لیکن اگر شرافت اور تہذیب کے یہ معنی ہیں کہ کثیر سے کثیر تعداد کو شریف اور مہذب بناؤ تو اس کے لئے ضروری کہ ہم اپنی مفروضہ بلندیوں سے کچھ نیچے آئیں اور کثیر سے کثیر تعداد انسان کو اپنے ساتھ اُبھار کر اپنی مفروضہ بلندیوں کو حقیقی بلندیاں بنائیں۔ ہماری اجتماعی اور انفرادی دونوں زندگیوں کے لئے اشد ضروری ہے کہ ہم اپنے سارے معیار و مذاق تمام اُصول و عقاید۔ اپنے تمام تعصبات پر نظر ثانی کریں اور ان کو بدلیں۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ موجودہ بحران سے ہماری زندگی صحیح و سالم نکل آئے اور پھر ترقی کی طرف چلے تو اس کی یہی ایک صورت ہے۔

گزشتہ ڈیڑھ سال کے اندر میں نے کئی مضامین لکھے ہیں جن میں کہیں مجمل اور کہیں مفصل ان مسایل سے بحث کی گئی ہے مثلاً "ادب اور زندگی"، "مبادیات تنقید"، "ادب اور ترقی"، "ادب اور زندگی میں بحرانی دور" وغیرہ معلوم ہوتا ہے کہ اختر علی صاحب کی نظر سے ان میں سے میرا کوئی مضمون نہیں گزرا اور نہ وہ "نگار کے نظیر نمبر" اور "موجودہ طرز تنقید" پر زیادہ سوچ سمجھ کر اظہار خیال فرماتے۔ آخر میں اپنے تبصرہ نگار دوست کو یہ صلاح دونگا کہ

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

یہی نظیر کی شاعری کا پیغام ہے اور یہی جدید نظریہ ادب کی صلاح۔

مجنوں گورکھپوری
(نیا ادب)

خان آرزو ایک نقاد کی حیثیت سے

اقبال حسین صاحب لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک طالب علم "خان آرزو" پر ریسرچ کر رہے ہیں اور اپنی محنت و کاوش سے انھوں نے بہت زیادہ معلومات اس وقت تک فراہم کر لی ہیں۔ یہ مقالہ انھیں کا ہے جو خان آرزو کی ایک کمیاب کتاب مثمر سے متعلق ہے۔ آپ کو اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ خان آرزو کا مرتبہ ایک نقاد ہونے کی حیثیت سے کتنا بلند تھا۔ (اڈیٹر)

خان آرزو کی تصانیف میں ایک گراں قدر کتاب مثمر بھی ہے۔ یہ کتاب دراصل قواعد فارسی سے متعلق ہے جس میں تحقیق الفاظ اور حروف تہجی کے مختلف استعمالات سے بھی بحث کی ہے۔ خان آرزو کتاب کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ کتاب جلال الدین السیوطی کی کتاب مزہر کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ شیخ کی کتاب عربی لغت سے متعلق ہے اور یہ فارسی لغت ہے لیکن اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جو عربی و فارسی دونوں زبانوں سے پوری طرح واقف ہو:-

"اما دریافت حقیقت ایں موقوف ست بر جامعیت عربی و فارسی و یک فنہ کمتر بہرہ مند از آن می شود"

خان آرزو کو اگر ہندوستانیوں میں لغت نویسی، انتقاد سخن، و قواعد فارسی کا موجد و مخترع کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ان سے پہلے ان فنون میں کسی نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ انھوں نے ان تینوں فنوں کی ابتدا کی اور کمال کو پہونچا دیا۔ ملا منیر لاہوری نے انتقاد کی اگرچہ داغ بیل ڈالی تھی لیکن انھوں نے ہمیں محض اعتراض کرنے کے طریقہ سے آگاہ کیا تھا۔ صحیح تنقید کیسی ہونی چاہئے یہ نہیں بتایا۔ لیکن خان آرزو نے سراج منیر، سراج وہاج اور داد سخن لکھ کر اس کو بھی بالکل واضح کر دیا ہے۔ تحقیق میں ان کا یہ مرتبہ ہے کہ ٹیک چند بہار ان کو سراج المحققین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ قواعد فارسی میں انکی دو کتابیں عطیۂ کبریٰ و موہبت عظمیٰ موجود ہیں۔ ان میں بھی ان کا یہی دعویٰ ہے کہ یہ ہندوستان میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ایسی کتاب لکھی۔ مثمر میں بھی یہی دعویٰ کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:

"منصف متتبع میداند کہ الی الآن دریں فن کتابے چنیں تالیف و تدوین نیافتہ و مسائل متفرقہ کہ اوائل بعضے از فرہنگہا مرقوم ست و در رسائل برخے مسطور در جنب آں حکم عدم دارد و چوں مولف در فن لغت فارسی کتب متعدد نوشتہ ۔ ۔ ۔ اصول علم مذکور در شیولا بقلم دادہ"

یہ کتاب اکتالیس اصلوں میں تقسیم کی گئی ہے جو مختلف موضوع پر ہیں۔ بعض اصلیں بہت طویل ہیں اور بعض نہایت مختصر۔ اصلوں کے تحت بے فصلیں ہیں جن میں اساتذۂ متقدمین و متوسطین کے استنادات پیش کئے گئے ہیں۔ فصلوں کے علاوہ مخفی نماند، بشنو، نقل، فوائد، برائگہ، تذئیل وغیرہ کے ضمن میں بھی کچھ چیزیں پیش کی گئی ہیں، جو تحقیق الفاظ وحل لغات میں بہت کار آمد ہیں۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی کے کتب خانہ میں موجود ہے، دوسرا ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور تیسرا پنجاب یونیورسٹی میں ہے۔

نثر کی پہلی اصل میں لفظ فارس و فارسی کی تشریح کی گئی ہے۔ دوسری میں اُن آثار و احادیث سے بحث کی گئی ہو جو زبان فارسی اور فارسیوں سے متعلق ہیں، یا معرفت لغت سے۔

خان آرزو پہلے شخص ہیں جنھوں نے زبان کے مسئلہ کو حل کیا۔ اُسوقت یہ بحث سامنے تھی کہ استناد و استشہاد کیونکر کرسکتے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ زبان کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ ایران کے مختلف خطہ کے لوگ مختلف طرح سے تلفظ کرتے ہیں اگرچہ تمام ایرانی فارسی زبان ہی میں گفتگو کرتے ہیں لیکن ہر خطہ کی زبان ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ شیراز کی اور ہے۔ قزوین و گیلان و خراسان کی اور، کاشان کی دوسری۔ امیر یحییٰ کاشی جو شیرازی الاصل ہیں فرماتے ہیں ؎

امتیاز قمی و کاشانی — این بود وقت گوہر افشانی
کہ قمی واکند بعرض دہن — کاشی آید بطول لب بسخن
ایکہ در فارسی مثل شدہ — الف و نون کند بواؤ بدل

اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں پر الف و نون ہوتا ہے وہاں پر کاشی واؤ بولتے ہیں۔ اگرچہ یہ امر کاشیوں ہی کیلئے مخصوص ہوگیا ہے لیکن اہل عراق و شیراز بھی اکثر اسی طرح بولتے ہیں مثلاً وہ دکان کو دکون اور جان کو جون کہتے ہیں اور اسی کنیۃ پر مخلصائے کاشی فرماتے ہیں:

کار معجون کمونی میکند پیکانِ او

کمان کو کمون سمجھا اور اسی وجہ سے معجون کمونی استعمال کیا اور مدار لطف شعر اسی پر رکھا لیکن سوال یہ ہے کہ جب کمان کو کمون بنایا تو پیکان کو پیکون ہونا چاہئے تھا اور یہ موافق محاورۂ فصحا غلط ہے۔ انھیں وجوہ سے خان آرزو محض انھیں ایرانی اساتذہ کا کلام قابل استناد سمجھتے ہیں جو خود عالم و فاضل ہوں اور مرکبات سے پوری واقفیت رکھتے ہوں۔

اساتذہ کے یہاں بھی صرفی و نحوی غلطیاں موجود ہیں۔ سعدی کے اکثر اشعار میں تعقید معنوی پائی جاتی ہے۔ خاقانی کے الفاظ وحشی و غریب ہیں حزیں کے یہاں افعال غلط پائے جاتے ہیں اور کہیں کہیں شرط و جزا میں بھی سہو ہوگیا ہے کہیں قافیہ کی پابندی کی وجہ سے غلطی ہوگئی ہے مثلاً ؎

غفلت از حادثۂ دہر بلاست — در رہِ سیل غنودیم عبث

"عبث" کی جگہ "غلط" ہونا چاہیئے۔ انھیں کی ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو جس میں ایسے الفاظ جمع کر دیئے گئے ہیں کہ تعقید معنوی پیدا ہو جاتی ہے ؎

غمگیں نمی رود کسے از خاک میکدہ　　تا ہم پیالۂ مہ عیدش نمی کنند

لفظ غمگین کی وجہ سے شعر کا مطلب خبط ہو گیا۔ ترجمہ اس شعر کا یہ ہے کہ "جب تک کسی کو مہ عید کا ہم پیالہ نہ کر دیں اسوقت تک وہ خاک میکدہ سے غمگین نہیں جاتا"۔ سوال یہ ہے کہ جب اس کو شراب ہی ملگئی جس کا وہ مدت سے منتظر تھا تو اب غمگین جانے کا سبب ہی کیا ہو سکتا ہے۔ خان آرزو کی رائے میں لفظ غمگین کے بجائے ہرگز کر دیا جائے تو معنی بالکل صحیح ہو جاتے ہیں!

ہرگز نمی رود کسے از خاک میکدہ　　تا ہم پیالۂ مہ عیدش نمی کنند

یعنی اسوقت تک کوئی خاک میکدہ سے نہیں جا سکتا جب تک کہ وہ شراب نہ پا جائے۔

ایک دوسرے ایرانی شاعر تازگی کا شعر ہے:

زنا قہ بفرقش چو دُمِ رباہ　　ابر فرق او یک کیانی کلاہ

رُباہ کو بحذف واو کلاہ کا ہم وزن نظم کیا ہے اور یہ خلاف محاورہ ہے۔

ایرانی مختلف مقامات پر رہنے کی وجہ سے الفاظ فارسیہ کو مختلف طریقہ سے لکھتے بولتے ہیں، مثلاً چِرا کہ بفتح و کسر، دونوں صورتوں سے مستعمل ہے۔ سخن، بضم خا و فتح دونوں طرح سے جائز ہے۔ اسی طرح پیلسم، بفتح و ضم دونوں طریقوں سے استعمال ہوا لیکن اُن میں صحیح کونسا ہے۔ خان آرزو کا فیصلہ ہے کہ چِرا، بکسر افصح ہے اس لئے کہ یہ مرکب ہو چہ استفہامیہ اور را سے (بمعنی برائے)، اسی طرح پیلسُم، بضم استعمال ہونا چاہیئے اس لئے کہ سُم کا اطلاق انسان کے پاؤں پر بھی ہوتا ہے، لہذا پیلسُم کے یہ معنی ہوئے کہ وہ شخص جس کا پاؤں مثل ہاتھی کے پاؤں کے ہو۔ رشیدی کا یہ کہنا کہ پیلسم ضرورت شعری سے فتح کے ساتھ بھی استعمال ہو سکتا ہے، صحیح نہیں۔

فارسی الفاظ کے علاوہ ایرانی کبھی الفاظ عربیہ میں بھی حرکت کا اختلاف جائز رکھتے ہیں مثلاً سجدہ، ضم کے ساتھ شیراز و خراسان میں جائز نہیں، دوسری جگہ بولتے ہیں۔ اسی طرح کافر جسے ایرانیوں نے بفتح استعمال کیا ہے۔ سیفی بدیعی

در شہر ہی ترکان جفا کیش ستمگر　　بے رحم ترے نیست ازیں قاسم کافر

اسی طرح بعض الفاظ ساکن کو متحرک استعمال کیا ہے، سعدی:

عفو کردم از و سے عملہائے زشت　　درازم بفضل خودش در بہشت

ناصر خسرو نے بھی روشنائی نامہ کے خاتمہ پر عفو کو بحرکت لکھا ہے:

اگر سہوے بود در وے عفو کن،　　دریدہ بُردہ کارم را رفو کن

بوقلمون بفتح قاف ولام درست ہے، لیکن ناصر خسرو نے بسکون دوم استعمال کیا ہے۔

از گلاب و مشک بهرش سازی آب و خاک و خشت — هم زعود و چندن آن را ردہ بوقلموں کنی

اسی طرح لفظ یرقان تحریک ہونا چاہئے لیکن بسکون استعمال کیا گیا ہے۔ زلالی ؎

چه غلوت غلوتے از رنگ جسته — اثر بر چہرۂ یرقاں شکستہ،

دوسرا اختلاف جو ایرانی جایز رکھتے ہیں وہ کیفیت تلفظ میں ہے یعنی بہت سے الفاظ جو مشدد ہیں انکو مخفف اور جو مخفف ہیں اُن کو مشدد کر دیا ہے۔ خوش کو رودکی نے مشدد نظم کیا ہے ؎

بپاکی گوئی اندر جام مانند گلاب استی — بخوشی گوئی اندر دیدۂ بے خواب خواب استی

اسی طرح 'کافیہ' جو ایک کتاب کا نام ہے اس کو طغرا نے مشدد لکھا ہے ؎

از گشت کافیہ زیر و زبر — نشد آگه از مبتدا و خبر

مشاطہ جو مشدد صحیح ہے نظیری بہ تخفیف استعمال کرتا ہے ؎

زمن مشاطۂ بستاں صداق می طلبد — ہنوز دختر رز در سراچۂ طلبی است

نظامی، نیت و جنازہ کو غیر مشدد لکھتے ہیں ؎

پناہندہ را یاد کرد از نخست — نیت کرد بر کامگارے درست

جنازہ بتنگ آمد از راہ تنگ — سر از بار سنگیں بر آمد بسنگ

ایرانیوں میں اختلاف کی ایک تیسری صورت حذف کی وجہ سے بھی رونما ہوتی ہے مثلاً چون و چرا کو بعض نے "چون و چر" کر دیا ہے۔ سیفی بدیعی:

غلطاں شوم براہ و نہ چوں گویم و نہ چر

سام نریمان کے بجائے سام نر استعمال کیا ہے:

تو آں بادشاہے کہ گر زندہ بودی — زمیں بوس دادے ترا سام بن نر

خان آرزو کے خیال میں "نر" نریمان کا لقب معلوم ہوتا ہے ورنہ اتنے حروف کا حذف کہیں اور نہیں نظر آیا

فروردین کے بجائے فردین استعمال ہوا ہے۔ عبدالواسع جبلی:

تا باد بر آں سرو بود در مہ آذر — تا برگ از آں زرد بود در مہ فردین

ایک دوسری جگہ اس نے فوردین بھی استعمال کیا ہے:۔

خورد باید بادۂ گلرنگ بوئے گل کنوں — چوں چمن خالی شد از گلہائے ماہ فوردیں

میر معزی نے پردین لکھا ہے:۔

ہمیشہ تاکہ جہاں را سپہر پیر کہن،　　جوان و تازہ بہ ہنگام پر و دیں دارد

ان سب صورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے، خان آرزو اس بات کو مانتے ہیں کہ زبان کا مسئلہ بہت دشوار ہے، اسلئے کہ صاحبان زبان بھی مختلف ہیں اور وہ ایک دوسری جگہ کے لوگوں کو نہیں مانتے مثلاً شیرازی، نظامی و مولوی کی زبان کو مستند نہیں مانتے۔ اسی وجہ سے وہ اس بات کے قائل ہیں کہ صاحبان زبان کو خواہ وہ ایرانی ہوں یا غیر ایرانی مستند ماننا چاہئے اور اسی لئے جمال اینجو شیرازی و سروری کاشی وغیرہ نے امیر خسرو کو مستند مانا ہے۔

عرب سوائے کلام عرب کے اور کسی کی سند نہیں مانتے لیکن زمخشری اور صاحب تلخیص المفتاح نے ابو ہمام وغیرہ کے اقوال سند میں پیش کئے ہیں۔ ہندوستانیوں کے کلام کا مستند ہونا تو ایک طرف وہ اس بات کے قایل ہیں کہ ہندی صاحبان قدرت کو زبان فارسی میں تصرفات کا حق حاصل ہے۔ ایرانیوں نے عربی، یونانی و ہندی میں تصرفات کو جایز رکھا ہے، اس لئے ہندوستانیوں کا تصرف بھی زبان میں درست ہونا چاہئے۔ وہ بیدل و امیر خسرو کے تصرفات مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایرانیوں کو ہندوستانیوں پر جو فضیلت ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اُن کا علم سماعی زیادہ وسیع ہے ورنہ علم قیاسی و کتابی میں ایرانی و غیر ایرانی دونوں برابر ہیں۔ ایرانی اساتذہ باوجود غلطیوں کے تو قابل استناد ہوں اور ہندوستانی جو کثرت ورزش و خدمت زبان فارسی کر کے اُن کے زمرہ میں شامل ہو گئے ہیں کیوں مستند نہ ہوں اور تصرفات نہ کریں؟ الفاظ ہندیہ کے فارسی میں استعمال کے متعلق خان آرزو فرماتے ہیں کہ جب فارسی میں ترکی، عربی، یونانی، ارمنی زبان کے استعمال سے کوئی نقص نہیں پیدا ہوتا تو کیا وجہ ہے کہ محض زبان ہندی پر قید لگائی جائے اور وہ نہ استعمال ہو؟ الفاظ ہندیہ فارسی میں بے تکلف استعمال ہو سکتے ہیں اساتذہ کے یہاں اس کا استعمال جائز رہا ہے، مثلاً حکیم سنائی:

نہ در آں معدہ خردۂ میدہ　　نہ دراں دیدہ قطرۂ پانی،

اسی طرح لفظ برسات۔ ہدآلہ:-

اندر ہمہ ہند بغایت برسات است

خان آرزو نے اپنے اشعار میں ہندی الفاظ بکثرت استعمال کئے ہیں اور جو دلیلیں پیش کی ہیں وہ آپ اپنی نظیر ہیں۔ یہاں پر انھوں نے ایرانیوں اور عربوں کے تصرفات دکھائے ہیں۔ مثلاً ارسطاطالیس کو جو یونانی زبان کا لفظ ہے۔ حکیم سنائی نے سطاطالیس کر دیا:

شدہ در حکمت و تدریس　　برتر از یونس و سطاطالیس

اصطرلاب کے بجائے فردوسی نے صلاب استعمال کیا ہے:

ہمہ زیچ و صلاب برداشتند　　بر آں کار یک ہفتہ بگذاشتند

اسی طرح لفظ مسروطوس ، مسرولیطوس جو مسرولیطوس کا مخفف ہے خاقانی کے یہاں پایا جاتا ہے۔

خاقانی نے علی الرودس کو علی الرؤس بہمزہ استعمال کیا ہے۔ بجائے ہمزہ کے واؤ ہونا چاہئے تمیز و تغیر دو دیا کے ساتھ ہے۔ ایرانی ایک ہی یا سے املان کرتے ہیں اور بعضوں نے مصدر سمجھا ہے اور اس سے مضارع بنالیا۔

سالک یزدی:

سالک بفروشید بادۂ صافی   گو ذائقہ محتسب تا بتمیزد

ضرورۃ سے ضرورت بنالیا، ظہوری:

بپائے نام کاخ اختتامش   ضرورت کہکشاں را نردباں گوئی

دوروں نے ضرورت کو بھی مخفف کرکے ضرور بنالیا۔ شفیعائے اثر:

از لطف تو ام ہرچہ ضرور است مہیاست   چیزے کہ من امروز ندارم غم فرداست

اسرار کو مخفف کرکے سرار بنالیا۔ مولوی:

باصد ہزار علم و عمل جاں فشاں قرین   از عالم سرار باظہار آمدی

کبھی ایرانیوں نے عربی الفاظ سے مصادر و افعال بنائے ہیں، مثلاً بتمیزد سالک یزدی کے یہاں موجود ہے

طلوعیدن امیر یحییٰ کاشی کے یہاں آیا ہے:

سو موئے سفید و خبرم نیست زغفلت   چوں خفتہ کہ غافل ز طلوعیدن صبح است

سیر بصیغہ امر وہاں آیا ہے۔ عرفی:

بگیر تحفۂ نظمے کہ زادۂ طبعم   درو بسیر و بہ بندیش کیں لطیف نہاد

شانی تکلو:

جہاں در سایۂ خورشید من معمور و من محروم   بکام غیر می سیر د عجب سیارۂ دارم

اسی طرح غارتیدن نظامی کے یہاں استعمال ہوا ہے:

جہود سے سیمہ راز اندود کرد   دکاں غارتیدن بداں سود کرد

یوں ہی فہمیدن و طلبیدن و رقصیدن ایرانیوں نے استعمال کیا ہے جو عربی الفاظ تمیز، طلوع، طلب، فہم رقص اور غارت سے لئے گئے ہیں۔ اسی خیال کی ترجمانی اپنی کتاب ضیابان میں بھی کی ہے، لکھتے ہیں:

"طلبید ماخوذ از طلبیدن است و آں از طلب کہ لفظ عربیت از تصرفات فارسیاں است و ایں قسم تصرف زیادہ از ہیچ و شش کلمہ نیست چنانچہ طلبیدن و فہمیدن و رقصیدن و غارتیدن — بعضے شعرا طلوعیدن نیز بستہ اند واہل توران نوجیدن نیز گویند"

(ضیابان قلمی کتب خانہ مسعود حسن صاحب رضوی)

بعض ایرانی شعراء نے اپنے کلام کی بنیاد مضحکہ و ہزل پر رکھی ہے اور ناموں سے مصدر بنائے ہیں۔ طرزی کہتا ہے:

مدنیدیم پس از نمیدن ۔۔۔ نہ بکس صلہ و نے نمریدن

مرقد پاک نبی طوفیدیم ۔۔۔ عمریدیم و ابا بکریدیم

مفردات کے علاوہ ایرانیوں نے اکثر عربی مرکبات میں بھی تصرف جایز رکھا ہے جو فاش غلطی ہے، مثلاً الحیّ سے الف ولام گرادیا ہے۔ نظامی:

برآورد موذن باوّل قنوت ۔۔۔ فسبحان حیّ الذی لایموت

مولوی جامی نے "لہم" بجائے الذین کفروا استعمال کیا ہے:

نقد عمر زاہدان در توبہ یکسر شد تلف ۔۔۔ قد لہم ان تنتہوا العصر لہم ما قد سلف

کمال خجند لفظ مع کو بجائے الیٰ لائے ہیں۔ حالانکہ یمیل کا صلہ الیٰ ہونا چاہئے نہ کہ مع۔ کمال خجند کا شعر:

سر دائم بہ تعدی ست چہ حاجت بدلیل ۔۔۔ ہمہ دانند کہ الجنس مع الجنس یمیل

کبھی یوں بھی تصرف ہوا ہے کہ عربی کی عبارت میں کچھ زیادتی کردی ہو۔ جامی:

ز دو شیخ شہر طعنہ بر احوال اہل دل ۔۔۔ والمرء لایزال عدو لما جہل

اصل عبارت قول جناب امیر المومنین علیہ السلام کی یہ "المرء عدو لما جہلہ" ایسی صورت میں حذف و زیادتی دونوں ظاہر ہے۔ بعض اوقات تصرف یوں بھی ہوا ہے کہ کلمات فارسیہ کو لباس عربی پہنا دیتے ہیں اور احکام الفاظ عربیہ ان پر جاری کردیتے ہیں مثلاً:

تا مہر تو گشت نور افشاں ۔۔۔ ذوالخورشیدین شد خراساں

اسی طرح نہنگ البحر و پلنگ الجبل شیخ شیراز کے رسالہ میں موجود ہے اور اناالیار، عالی کے اس شعر میں:

گل مگر لاف اناالیار زدہ در گلشن ۔۔۔ بر سر دار خیال سر منصور کشم

کبھی ایرانیوں نے فارسی مصدر سے عربی کے صیغہ بنالئے ہیں جیسے تراشیدن سے مُترَتّش۔ مفید بلخی:

ہر گل کہ خار خار طمع سر زند از و ۔۔۔ در دیدہ بد قماش چو روئے مُترَتّش است

کشمیر سے تکشمر بنانے کی مثال ملاحظہ ہو۔ عالی:

با ما با دب باش تکشمر بیجاست

کبھی ایرانی، الفاظ عربیہ سے اشتقاق کرتے ہیں مثلاً فلاکت بمعنی فلک زدگی و مفلوک بمعنی فلک زدہ، اسی معنی میں مفلاک و مفالیک بھی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً:

دلیلش ابلہ مرزوق و زیرک مفلاک

بے من تو شہ سریر دولت من بے تو زجملۂ مفالیک

اسی طرح ایرانیوں نے ناموں میں تصرف کیا ہے مثلاً یہ کہ ابراہیم بن ادھم کے بجائے وہ محض ادھم کہتے ہیں اور حسین بن منصور کو محض منصور۔ پور سکتبگتین کے بجائے محض سبکتگین کہدیا اور سعد وقاص کو محض وقاص۔ حافظ:

ناوک غمزۂ او دست برد از رستم صاحب ابروے او برد گرو از وقاص

کمال خجند:

چوں بتماشا آمدم روز شکار دلبراں دام دل سبکتگیں زلف ایاز یافتم

ایرانیوں کا ہندی الفاظ میں تصرف ملاحظہ ہو، شہر متھرا کو متورہ کر دیا۔ طغرا:

چوں زند شہر متورہ عرف از پا زد حسن بہر زیب نطق مصحف خوان گل از بر کنند

کبھی لفظ ہندی میں سے کوئی حرف حذف کر دیا جاتا ہے مثلاً جھکڑ کو عرفی جکر لکھتا ہے:

آں باد کہ در ہند گر آید جکر آید

اسی طرح انھوں نے گڑھ کو گور کر دیا اور بھو کو جو راجہ بھوج کا مخفف ہے۔ ایرانی بھو کہتے ہیں۔ یوں ہی بھیم کو بیم کر دیا اور فرخی نے بھیم بر وزن فہیم استعمال کیا۔

اسدی: سبکسار بر قلب لشکر زدند ربودند شان بر بھو در زدند

فرخی: چو ہزدالہ کہ اندر دیار ہند بہیم بہ ہزدالہ ہمی کرد برہاں تقدیم

میر یحییٰ کاشی نے بھی یہی غلطی کی کہ سنگھ کو جس کے معنے شیر کے ہیں، سنگ کا ہم قافیہ کر دیا:

سر راجپوتاں جگت سنگھ بود کہ بر شیشۂ نہ فلک سنگ بود

یوں ہی کھچڑی کو ایرانیوں نے کچری کر دیا۔ سالک:

سیر گشتم ز کچری ایام ہوس خوان سیم و زر نکنم

بعض الفاظ ایسے ہیں کہ فی الاصل ہندی ہیں لیکن اُنسے اور فارسی الفاظ بنائے گئے، مثلاً ماری ماخوذ ہے مار سے جو ہندی میں زدن کے معنے میں آتا ہے۔ عسجدی:

اگر ماری و کژدمی ہست طبعش بصحراش چوں مار و کژدم بماری

صاحب جہانگیری نے اس لفظ کے استعمال سے ناواقفیت ظاہر کی ہے حالانکہ وہ ہندوستان میں رہ چکا تھا اور ہندی و فارسی میں کس قدر توافق ہے اس سے واقف تھا۔ اس تحقیق کا فخر خان آرزو ہی کو حاصل ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

"...دن آنست کہ تا الیوم ہیچکس را توافق زبان ہندی و فارسی با ینہمہ کثرت اہل لغت چہ فارسی وچہ ہندی

کسے راں شدہ الافقیر آرزو ----- عجب از رشیدی وغیرہ کہ در ہندوستان بودہ اند وہیچ لحاظ نکردہ کہ دریں دو زبان چہ قدر توافق باشد"

ان تمام باتوں سے یہ واضح ہوگیا کہ ایرانیوں کے یہاں غلطیاں ہیں - انھوں نے غیر زبان کے الفاظ بھی اپنے یہاں استعمال کئے ہیں، اُن پر تصرفات کو بھی جایز رکھا ہے - ہندوستانیوں کے اشعار کو ایرانیوں نے سند میں بھی پیش کیا ہے، لہذا ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ہندوستانی بھی فارسی زبان میں الفاظ ہندیہ استعمال کر سکتے ہیں، علاوہ ایرانیوں کے غیر ایرانی کو بھی مستند مان سکتے ہیں اور زبان فارسی میں تصرفات کر سکتے ہیں جیسا کہ خسرو و بیدل نے کئے ہیں مثلاً

خسرو: اومیرود بنازو گرہ میبرد بزلف مردن مراست ازگرہ اوچہ می رود

فارسی 'ازکیسہ اوچہ می رود' بولتے ہیں لیکن امیر خسرو کے صاحب قدرت ہونے میں کیا شک ہے اور اس لئے اُن کا یہ تصرف بھی صحیح ہے:

بیدل: النوید آفتاب عالمتاب

فارسی الفاظ پر عربی الف ولام داخل کرنا صحیح نہیں ہے لیکن خان آرزو صحیح مانتے ہیں - ملاحظہ ہو:

"چوں از راہ قدرت تصرفات نمایاں در فارسی نمودہ مردم ولایت وکاسہ لیسان اینہا کہ از اہل ہند اند در کلام ایں بزرگوار سخنہا دارند وفقیر در صحت تصرفات صاحب قدرتان ہند ہیچ سخن ندارد بلکہ قائل است"

مثمر اگرچہ نہایت مشکل اور خشک موضوع پر لکھی گئی ہے لیکن خان آرزو کی عربی قابلیت اور تحقیق کی بہت کچھ آئینہ دار ہے - اس میں عربی و فارسی الفاظ کے توافق پر جو عالمانہ بحث کی گئی ہے وہ دیکھنے کی چیز ہے - اس میں قرآنی آیتوں کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ جناب محمدؐ مبعوث تھے جمیع امم پر لہذا وہ عارف جمیع زبان تھے اور اس وجہ سے وہ فارسی بھی بخوبی جانتے رہے ہوں گے - اس بحث میں انھوں نے رسول کے اقوال بھی پیش کئے ہیں جن میں فارسی الفاظ موجود ہیں - اس کتاب میں علاوہ فارسی لغتوں کے عربی میں امام فخر رازی، قاموس، امام ثعالبی، جلال الدین سیوطی کی عربی عبارتیں نقل کرتے ہیں - جواب بھی عربی میں کچھ دور تک لکھتے ہیں، اُن پر بحث کرتے ہیں اور جو بات غلط ہوتی ہے اُسے واضح کرتے ہیں۔

مثمر ہی پہلی کتاب ہے جس میں خان آرزو نے ایرانیوں کے فخر و غرور کو پست کیا اور ہندوستانیوں کو ان کے فضل وکمال کی بنا پر زمرہ ایرانیان میں شامل کیا۔

اقبال حسین

"جذبات بھاشا" کا جدید اڈیشن - کاغذ وکتابت نہایت نفیس - قیمت ۱۲ر - رعایتی قیمت ۹ر علاوہ محصول ----- منیجر نگار

دُنیا کی سب سے بڑی دوربین

دُنیا میں سائنس کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کا مطالعہ انسان کے لئے باعثِ حیرت نہ ہو، لیکن فلکیات کا مطالعہ تو انسان کو سراپا استعجاب بنا دیتا ہے۔ اس علم کے مقادیر یا اندازے اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ ان کو سنکر سر چکرانے لگتا ہے فلکیات میں ریاضی کے اعداد و شمار بالکل بیکار ہیں کیونکہ اس میں خیال انسانی سے بھی بلند ایسے فاصلوں سے بحث کیجاتی ہے جہاں انسان کا مقرر کیا ہوا کوئی اندازہ کام نہیں دیسکتا۔

چاند ہماری زمین سے ۲۴۰۰۰۰ میل کی دوری پر واقع ہے اور یہ فاصلہ ایسا ہے جسے ہم سمجھ سکتے ہیں، گویا اگر ہم زمین کے گرد نو یا دس مرتبہ چکر لگالیں تو گویا اتنا ہی فاصلہ طے کر لیا۔ لیکن سورج اس فاصلہ سے ۳۸۰ گنا زیادہ دور واقع ہے اور یہ دوری اتنی ہے کہ ہم اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے، کیونکہ انتہائی سرعت رفتار پر قابو پالینے کے بعد بھی کرۂ زمین کے گرد ۳۵۰۰ مرتبہ چکر لگانے کا سوال کوئی معنی نہیں رکھتا۔

آفتاب کا قریب ترین فاصلہ زمین سے اندازاً ۹۲۹۰۰۰۰۰ میل ہے اور فلکیات میں یہ فاصلہ صرف اکائی کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعہ سے ہم فضا کے دوسرے ستاروں کی دوری معلوم کرتے ہیں، ورنہ نظام شمسی سے ماوراء تو یہ اکائی بھی بیکار ثابت ہوتی ہے کیونکہ فضا کے سمندر میں تو ہمارا نظام شمسی بھی ایک قطرہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

روشنی، جس کی رفتار ۱۸۶۳۲۶ میل فی سکنڈ ہے، آٹھ منٹ میں سورج سے زمین تک پہونچتی ہے اور اسی روشنی کی رفتار کو معیار قرار دیکر ستاروں کے بُعد کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر کسی ستارے کی روشنی اسی رفتار سے ہم تک ایک سال میں پہونچتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ فلاں ستارہ ہم سے ایک نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہے یعنی اگر ہم اعداد کی صورت میں اس فاصلہ کو ظاہر کریں تو تقریباً ۵۸۸۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ میل ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ فاصلہ بھی ذہن انسانی کی سمجھ سے باہر ہے، چہ جائیکہ اُن ستاروں کا فاصلہ جن کی روشنی سیکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں سال میں ہم تک پہونچتی ہے کہ ان کو تو ہم اعداد میں ظاہر ہی نہیں کر سکتے، اسی لئے فلکیات میں دوری کی پیمایش، روشنی کی رفتار یا نوری سال سے کیجاتی ہے۔

ماہرین فلکیات کی تحقیق ہے کہ زمین سے قریب ترین سیارہ Proxima Centauri (قنطورس) ہے جس کی روشنی ۴ ۱/۲ سال میں ہم تک پہونچتی ہے اور بعید ترین سحابی کرہ جسے ہم آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں،

Andromeda (المرأۃ المسلسلۃ) ہے، جس کی روشنی ہم تک ۹ لاکھ سال میں پہونچتی ہے۔ لیکن یہ بُعد بھی فضا کی وسعت کے لحاظ سے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

آپ کہکشاں کو روزرات کے وقت دیکھتے ہیں، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہ مجموعہ ہے لاکھوں سیاروں کا جنمیں سے ایک نہایت حقیر سیارہ ہمارا آفتاب بھی ہے۔ پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ آفتاب، کہکشاں کے وسط میں اُس سے قریب واقع ہے، لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ کہکشاں کے مرکز سے وہ دو کرور یا اس سے زیادہ پانچ کرور نوری سال کے فاصلہ پر پایا جاتا ہے۔ ایک شخص کو حیرت ہوگی کہ یہ تمام باتیں کیونکر معلوم ہوسکتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دوربین کی ایجاد سے انسان نے فضا کی وسعت پر بہت کچھ قابو حاصل کرلیا ہے۔

سنہ ۱۹۳۷ء میں ایک ایسے سدیم یا سحابیہ[1] (Nebula) کے انحلال نور[2] کی تصویر لی گئی، جو زمین سے ۸ کرور نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ تصویر رصدگاہ جبلِ وِلسن (کیلی فورینا) سے لی گئی تھی اور دُنیا کی اس سب سے بڑی دوربین کی مدد سے، جس کا شیشہ ۱۳ انچ موٹا اور نو ہزار پونڈ وزنی ہے۔ اور جس کا قطر سو انچ کا ہے۔

اگر دوربین کی ایجاد نہ ہوتی تو اس میں شک نہیں کہ انسان فضا کے حالات سے بالکل بے خبر ہوتا، کیونکہ آنکھ سے ہم کو بہت کم ستارے نظر آتے ہیں۔ سنہ ۳۳ء میں ۳۵ سال کی کاوش و محنت کے بعد امریکہ کے ماہر فلکیات نے جو فہرست طیار کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے ہر حصہ سے دیکھنے کے بعد زیادہ سے زیادہ ۱۰ ہزار ستارے آنکھ سے نظر آتے ہیں اور چھوٹی دوربین کی مدد سے ۴۶۲۰۳ ستارے دکھائی دیتے ہیں اور یہ تعداد تمام فضا کے اندر پھیلے ہوئے سیاروں کو دیکھتے ہوئے، کچھ بھی نہیں ہے۔

گلیلو اور سر اسحاق نیوٹن کے بعد سے جو ترقی دوربین میں ہوئی ہے وہ بہت حیرتناک ہے۔ اسوقت دو قسم کی دوربین پائی جاتی ہے۔ ایک Refractor (عاکس) دوسری Reflector (کاسِر) دوسری قسم کی دوربین میں ایک چیز کا عکس براہ راست دوربین کے شیشہ پر حاصل کیا جاتا ہے جو ایک چھوٹے Lens (عدسہ) کے ذریعہ سے بہت بڑا ہو کر نظر آتا ہے، اور پہلی قسم کی دوربین میں روشنی ایک بڑے مقعر Concave شیشے سے گزر کر بہت سے چھوٹے چھوٹے عدسات پر پڑتی ہے اور یہ شیشہ جتنا بڑا ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ روشنی حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے آجکل جتنی دوربینیں استعمال ہوتی ہیں وہ اسی قسم کی ہوتی ہیں، کیونکہ ان کے ذریعہ سے دور کی بہت سی چیزیں جنھیں آنکھ نہیں دیکھ سکتی، نظر آجاتی ہیں۔ چنانچہ ولسن رصدگاہ کی سو انچ شیشہ والی دوربین سے

---

[1] اس سے مراد وہ سیارہ ہے جو نہایت گرم گیس یا دھویں کی حالت میں پایا جاتا ہے اور اس میں انجمادی کیفیت پیدا نہیں ہوئی۔

[2] مثلثی شیشے کے ذریعہ سے دیکھئے تو روشنی مختلف رنگوں میں تقسیم ہوجاتی ہے اور اسی کو انحلال نور کہتے ہیں۔

جس سدیم کی تصویر لی گئی وہ ۸۰ کرور نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہے۔

اس قسم کی دوربین سے یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ اگر کسی وقت سو فیٹ قطر شیشہ کی کوئی دوربین طیار ہو گئی تو فضائے بسیط کے بہت سے راز ظاہر ہو جائیں گے، لیکن چونکہ اتنی بڑی دوربین کی طیاری میں کم از کم ۳۰ لاکھ پونڈ کا صرف تھا اس لئے عرصہ تک اس طرف توجہ نہیں کی گئی، تاہم ایک وقت آگیا کہ ایسی دوربین طیار ہوئی جو فلکیات کا علم کہیں سے کہیں پہونچ گیا۔

دوربینوں کی ترقی

ایک صدی پہلے جو دوربین طیار کی گئی تھی اس کا شیشہ صرف ۱۵" انچ قطر کا تھا، اس کے بعد ۱۸۲۶ء میں ۲۵ انچ قطر کی دوربین طیار کی گئی۔ ۱۸۸۷ء میں ۳۶ انچ قطر کا شیشہ بنایا گیا اور ۱۸۹۷ء میں ۴۰ انچ قطر کا۔

عاکس قسم کی دوربین البتہ اس سے زیادہ قوی طیار ہوئیں، چنانچہ سر ولیم ہرشل (Herschell) نے ۱۷۸۹ء ہی میں ۴۸ انچ کا شیشہ طیار کر لیا تھا، لیکن اس نے یہ راز کسی پر ظاہر نہ کیا کہ اس نے اتنا بڑا شیشہ کس طرح ڈھالا اور اس پر پالش کیونکر کی۔ اس کے ۶۰ سال بعد آئرستان کے ایک ماہر فلکیات ولیم پارسنز (William Parsons) نے ۷۲ انچ قطر کا شیشہ بنایا اور تقریباً ۸۰ سال تک یہ اس سے بڑی دوربین کسی نے طیار نہ کی۔ لیکن چونکہ دوربین کی طیاری میں برابر کوششیں جاری تھیں، اس لئے آخر کار رصدگاہ وِلسن کی وہ دوربین طیار ہوئی جس کا شیشہ ۱۰۰ انچ قطر کا ہے۔

اس شیشے کی طیاری میں ۱۲۵۰۰۰ پونڈ صرف ہوئے ہیں اور تقریباً نو سال میں طیار ہوا ہے۔ اس کی بڑائی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا وزن ساڑھے چودہ ٹن ہے، بڑے بڑے پہیے جو پارہ بھرے ہوئے حوض میں تیر رہے ہیں اس کے وزن کو سنبھالے ہوئے ہیں اور ۴۰ موٹر اس کو حرکت میں لانے کے لئے رصدگاہ میں لگائے گئے ہیں۔

ہر چھ مہینے کے بعد اس کا شیشہ نکال کر اس پر چاندی کی پالش کی جاتی ہے۔ کیونکہ روشنی کے اثر سے چاندی کی پالش جلد خراب ہو جاتی ہے اور شیشہ اچھی طرح کام نہیں دیتا۔ یہ شیشہ پہلے چاندی کے تیزاب سے صاف کیا جاتا ہے اور پھر اس پر پالش کی جاتی ہے۔ اس شیشے کو اُتارنے چڑھانے کے لئے ایک زبردست (Hydraulic Jack) سے کام لیا جاتا ہے جو موٹر کے ذریعہ سے چلتا ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اتنا بڑا شیشہ ڈھالنا یا اس میں دو چار انچ کا اضافہ کر دینا مشکل بات نہیں، لیکن اس کو ایک ماہر فلکیات ہی سمجھ سکتا ہے کہ اتنے بڑے دوربینی شیشے کا طیار کرنا کسقدر دقت طلب ہے۔

رصدگاہ وِلسن کی دوربین کا شیشہ ڈھالنے میں آٹھ مرتبہ ناکام رہنے کے بعد نویں مرتبہ کامیاب ہوا اور یہ کام اتنی مصیبتوں کے بعد پورا ہوا کہ شیشہ ڈھالنے والوں نے کہدیا کہ اس سے بڑا عدسہ طیار کرنا ممکن نہیں۔ لیکن

ماہرین فلکیات کا تقاضہ اس سے بڑے شیشے کے لئے برابر جاری رہا۔

اس دوربین کے ذریعہ سے ۵۰۰ ملین نوری سال کی دوری پر واقع ہونے والے سیارے نظر آ سکتے ہیں اور ایک ارب ۵۰ لاکھ ستارے تصویر کشی کی حد میں آ گئے ہیں، لیکن ماہرین کا خیال ہے کہ فضائے بسیط کا قطر ۶ ارب نوری سال کے فاصلہ کا ہے جس میں کم از کم ۳۰ ارب ستارے پائے جاتے ہیں اور ان کے دیکھنے کے لئے یہ دوربین بھی کافی نہیں۔ آخر کار برطانیہ، جرمنی اور امریکہ کے ماہرین نے ملکر ایک ایسا نقشہ طیار کیا جس کا شیشہ ۲۰۰ انچ قطر کا ہو اور جبل ولسن کی دوربین سے وزن میں چوگنا ہو۔ صرف کا اندازہ ۱۲ لاکھ پونڈ کیا گیا اور امریکہ کے ایک کارخانہ کو یہ کام سپرد کر دیا گیا

اس کام کے ابتدائی اہتمام میں دو سال لگ گئے اور اول اول تین شیشے ۳۰، ۶۰ اور ۱۲۰ انچ کے تجربہ کے طور پر ڈھالے گئے اور جب اطمینان ہو گیا تو پھر سنہ ۱۹۳۴ء میں، اس بڑے شیشے کے ڈھالنے کا کام شروع ہوا۔

ایک بڑی بھٹی ۳۰ فٹ قطر کی برابر دس دن تک گرم کی گئی اور اس میں چالیس ٹن کانچ معہ دوسری اشیاء کے تین ہفتہ تک ۲۸۰۰ ڈگری کی حرارت پہونچا کر گلایا گیا۔

۲۵ مارچ اس کے ڈھالنے کی تاریخ مقرر تھی۔ اس تاریخ میں چھ ہزار آدمی اس کام کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے اور دنیا کا کوئی مقام ایسا نہ تھا جہاں سے ماہرین فلکیات اس کے دیکھنے کے لئے فراہم نہ ہوئے ہوں۔

آخر کار سگنل دیا گیا اور چار آدمیوں نے ایک بڑا ڈوا جس میں ۴۰۰ پونڈ وزن کا پگھلا ہوا شیشہ آ سکتا تھا، بھٹی میں ڈالا گیا اور پگھلا ہوا شیشہ نکالکر ایک نہایت گرم ہنڈے میں ڈالا گیا۔ یہ ہنڈا ایک ٹرالی کے ذریعہ سے سانچہ تک لیجایا گیا جو خود بھی انتہائی گرمی کی وجہ سے سفید تھا۔

دس گھنٹے تک یہ کام برابر جاری رہا۔ ہر پانچ یا دس منٹ کے بعد پگھلا ہوا شیشہ، سانچے میں ڈالا جا رہا تھا اور سب اپنی اپنی جگہ مطمئن تھے کہ دفعتاً سانچہ میں شگاف پیدا ہو گیا، ہر چند انجینیروں نے فوراً اس شگاف کو بھر دیا، پھر بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس سے کیا نقص پیدا ہو جائے گا۔ بہرحال کام برابر جاری رہا اور اسی کے ساتھ یہ بھی طے کیا گیا کہ دوسرا سانچہ بناکر ایک اور شیشہ ڈھالا جائے۔

پہلا شیشہ سات مہینے کے بعد (اکتوبر میں) سانچہ سے نکالا گیا لیکن وہ اب بھی گرم تھا۔ چونکہ شیشہ کو آہستہ آہستہ ٹھنڈا کرنے کی ضرورت تھی، اس لئے سانچہ کا درجۂ حرارت صرف ایک ڈگری روز کم کیا جاتا تھا یہاں تک کہ وہ چھونے کے قابل ہو گیا۔

جس وقت دوسرا شیشہ ڈھالا جا رہا تھا، اس وقت بھی ایک حادثہ پیش آ گیا۔ یعنی سیلاب آ گیا اور کارخانہ کی کھڑکیوں تک پانی آ گیا، لیکن خیر کسی نہ کسی طرح پانی کو اندر آنے سے روکا گیا اور کام ختم ہو گیا۔

جب شیشہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تو اس کو فولادی شہتیروں میں پیک کر کے اسپشل ٹرین کے ذریعہ سے براہ

نہر پناما کیلی فورنیا بھیجا گیا جہاں ایک خاص کارخانہ اس کے صیقل وغیرہ کے لئے طیار کیا گیا تھا۔

اس شیشہ کے گھسنے، رگڑنے اور صیقل کرنے کا کام تین سال میں ختم ہوگا، کیونکہ رگڑ کی گرمی سے اسکے خراب ہوجانے کا اندیشہ ہے اور یہ کام بہت آہستہ آہستہ ہوگا۔ اس غرض کے لئے ایک خاص مشین طیار کی گئی ہے جو ۴۰ فٹ لمبی ۳۰ فٹ اونچی اور ۱۰۰ ٹن وزنی ہے۔ گھسنے والا آلہ بالکل شیشہ کی ناپ کا ہے اور ہر گردش میں ایک انچ کے دس لاکھویں حصہ سے زیادہ نہیں گھستا۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ کام ختم ہوجائے گا تو دو ٹن وزن شیشہ کا کم ہوجائے گا۔ اس شیشے کے پیچھے ایک المونیم کی تڑپ بھی لگائی جائے گی جو ایک انچ کے ۴ لاکھویں حصہ سے زیادہ دبیز نہ ہوگی۔

جب یہ تمام مراحل ختم ہوجائیں گے تو پھر اس شیشہ کو پالومر پہاڑ کی رصدگاہ میں لے جائیں گے جہاں وہ دوربین میں نصب کیا جائے گا۔

یہ دوربین ستر فٹ لمبی ہے اور ۲۰ فٹ کا قطر رکھتی ہے۔ اس کا وزن شیشہ کو ملا کر ۸۰۰ پونڈ ہوگا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ جبل ولسن کی دوربین سے اس کی قوت دوچند ہوگی، یعنی اگر زمین کا محدب حصہ بیچ میں حایل نہ ہو تو پالومر سے نیویارک کی تمام عمارتیں نظر آئیں گی (جو تین ہزار میل دور ہیں)

جبل ولسن کی دوربین سے چاند کی وہ چیزیں نظر نہیں آتیں جن کا قطر ۳۰۰ فٹ سے کم ہے لیکن اس دوربین کی مدد سے ۳۰ فٹ قطر کی چیزیں بھی نظر آئیں گی گویا چاند، جو دو لاکھ ۴۰ ہزار میل دور ہے، اس کا فاصلہ ہم سے صرف ۸۰ میل رہ جائے گا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ اس دوربین کی مدد سے اس امر کا بھی فیصلہ ہوجائے گا کہ سیارہ مریخ میں جاندار اشیاء پائی جاتی ہیں یا نہیں۔ اور سورج کے متعلق بھی یہ معلوم ہوسکے گا کہ آیا اس کے انفجار (پھٹ کر ابل پڑنے) کا امکان ہے یا نہیں۔

"نگار" کے پچھلے پرچے

سنہ ۲۶ء: جنوری ۸ر — سنہ ۲۸ء: اگست عہ — سنہ ۲۹ء: مئی عہ، جون عہ — سنہ ۳۰ء: مئی ۱۲ر
سنہ ۳۱ء: جولائی تا دسمبر ۸ر فی پرچہ — سنہ ۳۲ء: جنوری ۱۲ر - فروری، مارچ، مئی، جون، جولائی، ستمبر، نومبر ۸ر فی پرچہ۔
دسمبر عہ — سنہ ۳۳ء: فروری ۸ر — سنہ ۳۴ء: فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ ر فی پرچہ —
سنہ ۳۶ء: دسمبر ۱۲ر — سنہ ۳۷ء: فروری، مارچ ۱۲ر فی پرچہ - اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ر فی پرچہ —
ستمبر، اکتوبر، دسمبر ۱۲ر فی پرچہ — سنہ ۳۸ء: فروری، اپریل تا دسمبر ۴ر فی پرچہ — سنہ ۳۹ء: فروری تا جولائی ۴ر فی پرچہ
اگست ۱۲ر اکتوبر و نومبر ۸ر فی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

تاریخ صحفِ سماوی

گزشتہ ستمبر کے نگار میں پروفیسر نواب علی صاحب کا ایک مقالہ قرآن مجید کے متعلق شایع ہوا ہے، جس میں انھوں نے مجھے اپنی کتاب "تاریخ صحف سماوی" کے مطالعہ کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ مینے اس مقالہ پر نوٹ لکھتے ہوئے صاف صاف لکھدیا تھا کہ جب تک اس کتاب کو دیکھ نہ لوں گا، کوئی رائے ان کے مقالہ کے متعلق ظاہر نہ کروں گا۔

لیکن جب ستمبر کا نگار شایع ہونے کے بعد نواب علی صاحب نے مہربانی فرماکر اس کتاب کا ایک نسخہ میرے پاس بھیجا تو مجھے خیال آیا کہ یہ کتاب میرے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے اور عرصہ ہوا میں اس کو دیکھ چکا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ نواب علی صاحب نے اس کتاب کی تالیف میں کافی محنت سے کام لیا ہے، لیکن اول اول مینے جب اس کتاب کو پڑھا تھا، اس وقت بھی مجھے یہ کوئی مکمل چیز نہ معلوم ہوئی تھی اور اب تو مجھے یہ بالکل ہی تیسرے درجہ کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

اوسط سایز کے صرف ۲۲۴ صفحات میں تمام صحف سماوی کی تاریخ کو جملہ مالہ وماعلیہ کے ساتھ یکجا کر دینے کا دعوی کرنا اور اسی کے ساتھ یہ کہنا کہ قرآن مجید پر جتنے اعتراض ہوئے یا ہوسکتے ہیں ان سب سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے، یکسر طفلانہ ادعا ہے۔

انھوں نے توراۃ وانا جیل کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس سے مجھے بحث نہیں، (گو یہ جانتا ہوں کہ ۸۰ صفحے میں انھوں نے کیا لکھا ہوگا اور کیا دادِ تحقیق دی ہوگی) لیکن کلام مجید کے متعلق جو کچھ انھوں نے ۱۴۴ صفحات میں لکھا ہے، اس سے مجھے ضرور تعلق ہے، اور مینے اسے غور سے پڑھا، لیکن یہ معلوم کرکے مجھے حیرت ہوئی کہ اب سے تقریباً ایک رُبع صدی قبل جو کتاب نواب علی صاحب نے لکھی تھی، اسے اب بھی قابلِ ذکر سمجھتے ہیں اور اُن کی عقل و فکر اب سے ۲۵ سال پہلے جس نقطہ پر پائی جاتی تھی اس سے ایک انچ آگے نہ بڑھ سکی، حالانکہ گزشتہ بیس سال کے اندر ذہن انسانی نے تحقیق حق اور جستجوئے صداقت کا جو معیار مقرر کیا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے، ایسی کتابیں اب بالکل دفتر پارینہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حیرت ہے کہ پروفیسر نواب علی صاحب ایک طرف اپنے آپ کو پروفیسر الیان وجری (ایسے مستشرق) کی عنایت کا

کا "مشکوک" ہونا بھی ظاہر کرتے ہیں اور دوسری طرف کتاب ایسی پیش کرتے ہیں، جو بے لاگ محقق کے بجائے نہ صرف یہ کہ ایک متعصب انسان کی فکر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے بلکہ بہت سے ایسے مباحث کی طرف سے بھی خاموش ہے، جن کا ذکر کئے بغیر کوئی شخص "قرآن مجید" کو الہامی کتاب ثابت کر ہی نہیں سکتا۔

یہ کتاب تین ابواب پر منقسم ہے، پہلے باب میں عہد عتیق کے صحایف سے بحث کی گئی ہے، دوسرے میں عہد جدید کے صحایف سے اور تیسرے باب میں جو سب سے بڑا باب ہے، قرآن مجید پر گفتگو کی گئی ہے۔

پہلے دو ابواب میں، نواب علی صاحب کی ساری کوشش اس بات پر صرف ہوئی ہے کہ وہ توراۃ اور انجیل کو محرف ثابت کر دکھائیں اور تیسرے باب میں انھوں نے قرآن مجید کو الہامی چیز ثابت کرنا چاہا ہے، لیکن نہ توراۃ و انجیل کی تحریف کی بابت وہ اس سے زیادہ کچھ کہہ سکے جو تمام عیسوی لٹریچر کو نظر انداز کر دینے کے بعد، عام طور پر مسلمانوں کی طرف سے کہا جاتا ہے اور نہ قرآن مجید کی تصدیق کے باب میں انھوں نے کوئی ایسی جامع بحث کی جو تمام شکوک و شبہات کو دور کر سکتی۔

تیسرے باب کی ابتدا انھوں نے نزول قرآن کے بیان سے کی ہے اور اس سلسلہ میں نواب علی صاحب کے اجتہاد کی صرف ایک مثال "لوح محفوظ" کے ذکر کے سلسلہ میں سامنے آتی ہے، جہاں وہ "لوح محفوظ" کو "سینۂ مسلم" قرار دیتے ہیں۔ لیکن کسقدر عجیب بات ہے کہ وہ اس مسئلہ میں تو تمام اُن روایات کو نظر انداز کر جاتے ہیں جو مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر میں، استنادی حیثیت رکھتی ہیں اور صرف ایک فقرہ میں یہ خیال ظاہر کر کے اس عجلت کے ساتھ گزر جاتے ہیں، گویا خود انھیں بھی اس خارزار سے دامن کشاں گزر جانے کا یقین نہیں ہے۔ لیکن دوسرے مسایل میں وہ کسی ایک روایت کی تاویل کرنے پر بھی مایل نظر نہیں آتے۔

اُس شخص کی طرف سے جو "لوحِ محفوظ" کی تاویل کر کے اسے "سینۂ مسلم" قرار دے، عقل انسانی کی بہت سی توقعات وابستہ ہو جانی چاہئے، لیکن افسوس ہے کہ یہ روشنی نواب علی صاحب کے ذہن و دماغ میں ایک لمحہ سے زیادہ نہ ٹھہر سکی اور اپنے بعد تمام وہی تاریکیاں چھوڑ گئی جن میں بھٹکتے رہنے کی مثالیں، ایک نواب علی صاحب کیا تمام قدامت پرست مسلمانوں کی طرف سے ہمیشہ ملتی رہتی ہیں اور ملتی رہیں گی۔

نواب علی صاحب عربی رسم خط کی تحریر، جمع قرآن کی تاریخ اور اس کی ترتیب پر تو تقریباً چار جزو صرف کر دیتے ہیں (جو زیادہ مابہ النزاع باتیں نہیں) لیکن اعتراضات کو پورا ایک جزو دینے میں بھی بخل فرماتے ہیں، گویا اُن کے نزدیک قرآن مجید کو صرف ایک مسلم کے نقطۂ نظر سے دیکھنا زیادہ ضروری ہے اور غیر مسلم زاویۂ نگاہ قابل اعتنا نہیں حالانکہ اُصولاً معاملہ اسکے برعکس ہونا چاہئے تھا۔

انھوں نے صرف دو اعتراضوں کو سامنے رکھا ہے ایک یہ کہ قرآن مجید میں تاریخی غلطیاں پائی جاتی ہیں اور

دوسری یہ کہ اس کی ترتیب ناقص اور ادبی حیثیت معمولی ہے، لیکن انھوں نے اور دوسرے اعتراضات سے بحث نہیں کی جو بربنائے روایاتِ اسلامی قصصِ قرآنی پر عیسوی جماعت کی طرف سے اور برنبائے عقل، پورے کلام مجید پر لامذہب لوگوں کی طرف سے وارد ہوتے ہیں۔ اب سے بیس سال پہلے جب یہ کتاب لکھی گئی تھی، اہل کلیسا اور لامذہب مفکرین کے اعتراضات اُس وقت بھی موجود تھے اور اب بھی موجود ہیں۔ لیکن نواب علی صاحب کے نزدیک اُسوقت بھی وہ قابل توجہ نہ تھے اور غالباً اب بھی نہیں ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ وہ مجھے اس کتاب کے مطالعہ کی دعوت نہ دیتے۔

میں سمجھتا تھا کہ نواب علی صاحب نے کلام مجید کی بحث میں اس کتاب کی طرف مجھے غالباً اس لئے متوجہ کیا ہے کہ اپنے شبہات کا جواب میں اس میں پاؤں گا، لیکن افسوس ہے کہ میں نے کوئی ایک بات بھی اس میں ایسی نہیں پائی جو قرآن مجید کے باب میں روایات سے ہٹکر درآیت یا غیر معقولات سے ہٹکر معقولات سے متعلق ہو۔

کلام مجید کے متعلق سب سے پہلے یہ گفتگو سامنے آتی ہے کہ اُس کے کلام الٰہی ہونے کا مفہوم کیا ہے، لیکن اس کا مطلق کوئی ذکر اس کتاب میں نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر یہ دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ وحی و الہام سے مراد کیا ہے اور خود قرآن سے کیا مستنبط ہوتا ہے لیکن اس سے بھی کسی جگہ بحث نہیں کی گئی اور آخیر میں ایک ناگزیر بحث یہ ہونی چاہئے تھی کہ قرآن مجید کے الہامی ہونے پر دوسروں نے کیا اعتراضات کئے ہیں، لیکن ان کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں کی گئی، پھر میں حیران ہوں کہ اس کتاب کے دیکھنے کی ہدایت کیا مجھے صرف بپتسمہ دینے کی غرض سے کی گئی تھی، یا نواب علی صاحب یہ سمجھتے تھے کہ ان کی کتاب واقعی کوئی افسوں ہے جو دیکھنے اور سننے والے کو فوراً مسحور کر دے گی۔

مجھے نواب علی صاحب کی نیت بخیر ہونے میں کلام نہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس کی نیت اچھی ہو، اس کا ہر کام محض اس کی خوش نیتی کی وجہ سے سراہے جانے کے قابل بھی ہو۔

وہ زمانہ گزر گیا جب مذہب نے عقل کے دروازے ساری دُنیا پر بند کر دئے تھے اور ان پر تیغ و تفنگ کے پہرے لگا رکھے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے، کہ ایک بیوقوف کو بیوقوف ثابت کرنے کے لئے بھی آپ کو عقل سے کام لینا ضروری ہے، چہ جائیکہ آپ ادعائے دانشمندی کریں کہ اس صورت میں تو آپ کو تمام حقایق کا مقابلہ کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

اب نہ ارسطو کے عالم مثال کو کوئی پوچھتا ہے نہ صوفیہ کے عالم امر کو، اب تو انسان مخلوق ہونے کی حیثیت سے، عالم خلق ہی کو سامنے رکھکر گفتگو کرنا پسند کرتا ہے اور جب تک آپ کے ایک ایک لفظ کا عقلی و علمی احتساب نہ کر لے وہ آپ کی کوئی بات ماننے کے لئے طیار نہیں۔

پھر یہ تو ہو سکتا ہے کہ نواب علی صاحب کی یہ کتاب قدامت پرستوں کی قدامت پرستی کو اور مستحکم کر دے، لیکن آزاد خیال لوگوں کے لئے جنھیں وہ اپنی زبان میں "زنادقہ" کہتے ہیں، اس میں ادنےٰ وجہ تسکین بھی نہیں پائی جاتی۔

میں بھی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہوں اور مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے اگر کوئی شخص ہمارے مسلمات پر اعتراض کرتا ہے، لیکن میں آزادی کے ساتھ سوچنے کا حق کسی سے نہیں چھین سکتا اور اس لئے میری تکلیف کی نوعیت قدامت پرست مسلمانوں کی تکلیف سے جدا ہے۔ اُن کے پاس تنہا ذریعۂ دفاع صرف یہ ہے کہ وہ معترض کے خلاف کافر یا ملحد ہونے کا فتویٰ دیدیں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ اعتراضات کو حقایق کی روشنی میں دیکھوں اور اگر واقعی ہمارے عقاید یا مسلمات میں کوئی ایسی غلطی پائی جاتی ہے، جس پر اصرار کرنا دوسروں کو ہنسنے یا طعن کرنے کا موقع دیسکتا ہے تو ان کی اصلاح پر غور کروں۔

جب ایک طرف میں یہ دیکھتا ہوں کہ اسلام نام ہے آسانی کا، امن و سلامتی کا، ترقی و استعلاء کا تو میری امیدیں بہت بلند ہوجاتی ہیں اور میں ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ واقعی اسلام سے زیادہ فطری تعلیم کسی اور مذہب نے نہیں دی لیکن جب ہمارے، علمائے کرام کا طرزِ عمل، ان کی تعلیم ان کی قدامت پرستی اور اُن کا پُر خشونت اخلاق میرے سامنے آتا ہے تو پھر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہوں کہ اگر اسلام واقعی سچا مذہب ہے، تو کم از کم یہ مولویوں کے پاس تو ہے نہیں اور اس کی جستجو کہیں اور کرنا چاہئے اور یہی جستجو مولویوں کو پسند نہیں!

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی مذہب کا انحصار صرف مراسم و شعائر ظاہری پر ہو جاتا ہے تو اس کی روح مردہ ہوجاتی ہے اور اس مذہب کے ماننے والوں میں ایک خاص قسم کی کرختگی، خشونت اور قساوت پیدا ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کا اثر دنیاوی زندگی اور معاشرت و معیشت پر بھی پڑنے لگتا ہے۔ بالکل یہی حال اسوقت کے مسلمانوں کا ہے کہ مذہب کی روح تو ان میں سے فنا ہوگئی ہے اور صرف نمازیں پڑھلینا، روزہ رکھ لینا اور ریش و بروت کو خاص شرعی حد سے گھٹنے بڑھنے نہ دینا، کافی سمجھا جاتا ہے۔

درانحالیکہ ان کے اخلاق اس درجہ پست ہیں کہ مشکل سے انھیں انسانوں کے زمرہ میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ بیرحمی، بدعہدی، خیانت، خود غرضی اور نفس پرستی، ان کی زندگی کا شعار ہے اور اجتماعیت جو اسلام کا اصل مقصود تھا ان سے بالکل فنا ہوگئی ہے۔

پھر چونکہ مذہب پرست عوام کے اخلاق کے ذمہ دار ہمیشہ مذہبی رہنما ہوا کرتے ہیں، اس لئے ان تمام برائیوں کی ذمہ داری حقیقتاً مولویوں پر عاید ہوتی ہے، جنھوں نے خدا کی پرستش کے بجائے اپنی پوجا لوگوں سے کرائی اور عوام کی عقلوں پر مُہر لگا کر، اُن سے سوچنے، سمجھنے اور احتساب کرنے کی قوت چھین لی۔ یہاں تک کہ اگر آج کوئی شخص تعلیماتِ قرآنی کو خود سمجھنا چاہتا ہے تو ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک تمام مولوی گیدڑوں کی طرح شور مچانے لگتے ہیں گویا اُن کی روزی کا ٹھیکرا اُن کے ہاتھ سے چھینا جارہا ہے اور وہ ڈرتے ہیں کہ اُن کے چہرے کے بدنما خط و خال بے نقاب نہ ہوجائیں۔

اہل مذہب کی کمزوری اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ ایک معترض کو مطمئن کرنے کی جگہ گالیاں دینے پر اُتر آئیں اور خدا کو صرف اس چار دیواری کے اندر بند کر دیں، جو خود انھوں نے طیار کی ہے۔

یقیناً کسی مذہب کے متبعین میں اس قدر تنگ نظری کا پیدا ہوجانا، اس مذہب کے موت کی علامت ہے اور ہمارے مولوی عرصہ سے اسلام کو اس کی موت سے قریب تر کرتے جارہے ہیں۔

یہ ہیں میرے وہ تجربات جن کی بنا پر میں نے خود اپنی عقل سے اسلام کو سمجھنا چاہا تاکہ میں اُس کی اُس حقیقی سطح کو پاسکوں جہاں سے وہ ساری دُنیا کو اپنے اندر شامل ہونے کی دعوت دیتا ہے اور یہیں سے میری اور عام مسلمانوں کی راہ الگ ہوجاتی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اسلام بے عقلوں کا مذہب نہ بنا رہے، بلکہ اہل عقل کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے اور اس کی صورت صرف یہ ہوسکتی ہے کہ ہم ان کے شبہات کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن ہمارے علماء نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی اور اس کا سبب میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان میں اس کی اہلیت ہی نہیں ہے کہ وہ ایک بے لوث اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرسکیں۔

میں نے مذہب کی مخالفت میں جتنی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اس سے زیادہ مذہب پرستوں کے لٹریچر کو دیکھا ہے، لیکن آج تک کوئی مذہبی کتاب میری نظر سے ایسی نہیں گزری جسے میں معترضین کے سامنے پیش کرسکوں۔

جس وقت، نواب علی صاحب نے مجھے اپنی کتاب کے مطالعہ کی دعوت دی تھی، تو میں خوش ہوا تھا کہ شاید اس میں مجھے کوئی نئی چیز نظر آئے گی، لیکن افسوس ہے کہ یہاں بھی وہی جنس کاسد نظر آئی۔

مجھے اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ نواب علی صاحب کو حقیقتاً ان اعتراضات کا علم ہی نہیں ہے جو قرآن پر کئے جاتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ وہ اسی عدم علم کو اپنا بڑا کارنامۂ علم قرار دیتے ہیں۔

مجھے وہ بظاہر محبت سے "کافرادب" فرماتے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کے اندر کونسا جذبہ کارفرما ہے اور میں اُن کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ قرآن کا حقیقی مفہوم اگر کوئی شخص کبھی پیش کرے گا تو وہ کوئی "کافرادب" ہی ہوگا، نہ کہ روایتی مسلمان!

نوٹ کر لیجئے کہ پرانے پرچے پر ڈاکخانہ بجائے رعایتی محصول ایک پیسہ فی پرچہ کے پانچ گنا وصول کرتا ہے۔ اس لئے اگر دفتر میں پرچہ کی عدم وصولی کی اطلاع آخر ماہ تک نہ آئی تو ہم پرچہ بیرنگ بھیجنے پر مجبور ہوں گے اور آپ کو ۲؍ ۲ دیکر پرچہ وصول کرنا پڑے گا یا اگر اطلاع کے ساتھ پانچ پیسے کے ٹکٹ بھی موصول ہوں گے تو تعمیل ہوسکیگی ورنہ نہیں۔ اور اس کے لئے دفتر مجبور ہے۔

منیجر نگار

مکتوبات نیاز

ہاں، بھئی، شکر ہے ــــ "موسمِ دیر غنودن بہ شبستاں آمد" لیکن، اس کا کیا علاج کہ میں تو دُنیا کی اس بھری انجمن میں بھی تنہا ہوں

کون سنتا ہے کہانی میری !

پرسوں ذکی کا خط آیا تھا - غریب حد درجہ ملول ہیں، اور ہونا چاہئے، بیس سال کا ساتھ یوں دفعتاً چھوٹ جانا، معمولی بات نہیں جس پر آسانی سے صبر کر لیا جائے، لیکن صبر نہ کریں گے تو کریں گے کیا۔

ہم روز ہزاروں چیونٹیوں کو پامال کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں، ممکن ہے اُن کی دُنیا میں ان حوادث پر شور و شیون ہوتا ہو، لیکن ہمیں خبر نہیں ہوتی - پھر قدرت سے تو ہم کو وہ نسبت بھی نہیں جو چیونٹی کو ہم سے ہے۔ اس لئے شکایت کیجئے بھی تو سنتا کون ہے۔

پھول کی پنکھڑیاں جب خشک ہو کر زمین پر گر جاتی ہیں، تو باغبان انھیں درخت کے پاس بھی نہیں رہنے دیتا، چُن کر دور پھینک دیتا ہے۔ نباتات کی دنیا میں اس ظلم پر کتنا ماتم ہوتا ہوگا، اس کا حال باغبان سنے بھی تو سوائے ہنسنے کے اور کیا کر سکتا ہے۔

میں نے انھیں تعزیت کا خط لکھدیا ہے، تم بھی لکھ دو۔ تسکین و سکین تو خیر کیا ہوگی، لیکن "تہذیبِ ماتم" کا خیال تو بہر حال رکھنا ہی ہے۔

میں نے سوچا تھا کہ چند دن کے لئے انھیں اپنے پاس بلالوں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ ابھی چند دن اور رولیں غم کو آنسوؤں ہی سے دُھلنا چاہئے۔

شفیق کا کوئی خط عرصہ سے نہیں آیا ــــ غالباً اچھے ہی ہوں گے۔

صدیقی، آپ کے خط نے بہت مایوس کیا - یہاں ہر شخص منتظر تھا کہ آپ آتے ہی ہوں گے، لیکن جب آپ کا تار ملا تو

بس خوں ٹپک پڑا نگہِ انتظار سے

تفصیل تو خیر آپ کے خط سے معلوم ہوگی، لیکن قیاس کہتا ہے کہ شاید بیگم کی طبیعت خدانخواستہ زیادہ مضمحل ہے۔ میں نے آپ کو پہلے بھی لکھا تھا اور اب پھر لکھتا ہوں کہ بہترین علاج تبدیل آب و ہوا ہے، میں جانتا ہوں آپ کو اپنے مشاغل سے فرصت نہیں، لیکن اسے کیا کیجئے کہ جگہ چھڑا دینے والی بیماریاں انھیں کے یہاں زیادہ آتی ہیں، جنھیں جگہ چھوڑنے کی فرصت نہیں - پھر کیا ضرور ہے کہ آپ بھی ساتھ رہیں۔ آتے جاتے رہئے اور انھیں کسی صحت گاہ میں چھوڑ دیجئے۔

آپ کی یا اُن کی عمر اب "تاب وصل" یا "طاقت جدائی" کے مسایل پر غور کرنے کی تو ہے نہیں کہ آیندہ شکوہ و شکایت کا اندیشہ ہو، اس لئے میری رائے تو یہی ہے کہ آٹھ دس دن کا وقت نکال کر انھیں پونا پہونچا دیجئے اور پھر واپس آجیئے بچے ماشاءاللہ سیانے ہیں، جو بورڈنگ میں رہ سکتے ہوں انھیں بورڈنگ بھیجدیجئے اور جو اس قابل نہیں ہیں ان کے لئے آپ کے پاس اتاؤں دداؤں کی کمی نہیں۔ رہ گئے آپ، تو آپ کا دل بہلانے کے لئے داغ و جرأت کی شاعری کا موضوع ہر جگہ میسر آسکتا ہے۔

میں آپ کے خط کا منتظر ہوں۔ اگر نہ لکھا ہو تو اب لکھئے دل کو تردد ہے۔

مکرمی - یہ صحیح نہیں کہ دہلی دبائے "ناسخیت" سے بچا رہا۔ ناسخ نے کیا کیا تھا جو شاہ نصیر نے نہیں کیا۔ اور تو اور، غالب ایسا معیاری شاعر بھی اس بلا سے نہ بچ سکا۔

نفی سے کرتا ہے اثبات تراوش گویا   دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجاد "نہیں"

دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے   سویدا میں، سیرِ عدم دیکھتے ہیں

نامۂ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک   آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

بن گیا تیغ نگاہِ یار کا سنگ فساں   مرحبا میں، کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان   نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا   کیا بیتاب کاں میں جنبش جوہر نے آہن کو۔

حلقے ہیں چشمہائے کشادہ بہ سوئے دل ہر تارِ زلف کو نگہ سرمہ سا کہوں

آپ اس کو کیا کہیں گے، کیا ناسخیت کچھ اور چیز تھی، کیا شاہ نصیر نے کچھ اور کیا تھا ؟ فرق اتنا ضرور ہے کہ لکھنؤ نے اس کو ایک مکمل آرٹ بنا دیا اور دہلی یہ بھی نہ کر سکا (گو یہ کوئی فخر کی بات نہ ہوتی)

اس میں شک نہیں کہ صحیح رنگ تغزل کی مثالیں ہم کو دہلی اسکول میں زیادہ ملتی ہیں، لیکن "تراش خراش" کا سہرا یقیناً لکھنؤ کے سر ہے۔

آپ کیوں اس بحث میں پڑ کے وقت ضایع کریں گے۔ کوئی اور کام کی بات کیجئے۔

حضرت،

معلوم ہوا ہے کہ آپ ترک دنیا کر کے کسی طرف ہجرت کرنے والے ہیں۔ ٹھیک تاریخ معلوم ہو تو جامۂ احرام لیکر حاضر ہوں۔ کچھ تو سعادت مجھے بھی حاصل ہونا چاہئے۔

پوچھنے کا حق تو حاصل نہیں، لیکن جی نہیں مانتا اور پوچھنا پڑتا ہے کہ کیا یہ ارادہ کسی جذبۂ روحانی سے مجبور ہو کر اختیار کیا گیا ہے ؟۔ اگر کوئی درویش کامل ایسا مل گیا ہے تو مجھے اس کا پتہ بتائیے، میں بھی اب یہی چاہتا ہوں کہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے روزی مل جایا کرے، اور ممکن ہو تو وہ سامان تعیش بھی جن کی خانقاہوں میں کمی نہیں۔ اللہ آپ پر رحم کرے !

قبلۂ عالم، میں اور آپ کے آستانہ سے منحرف ہوں ! اس زندگی میں تو ممکن نہیں۔ یہ آپ نے کیا فرمایا ؟ ایک عمر کی جستجو کے بعد یہی، تو ایک در ملا ہے۔

گرد از سرِ کوئے یار برخاست آہے زدم و غبار برخاست

کچھ دن اور خاک اُڑانے دیجئے، اس کے بعد اگر میرا ذوق جنوں کسی اور طرف لے گیا تو بیشک مجبوری ہے، لیکن ابھی تو مجھ سے خفا نہ ہوجئے۔

قارون، ابھی ابھی تمھارا خط ملا، اگر جگر کا خون کرنے کی فرصت ہو تو اس میں شک نہیں کہ دل کا معاملہ کرنے میں تم سے بہتر اسوقت کوئی نہیں ! غضب خدا کا، میں ایک بات کہتا ہوں صرف محبت و خلوص کی بنا پر اور تم اسے شکر بھی کھا تا ئے بیٹھتے ہو۔ خدا تمھاری اس ریاض دانی اور عملیت پسندی کو غارت کرے، اور کیا کہوں۔

آیندہ کے لئے عہد کرتا ہوں کہ کبھی تم سے کوئی بات ایسی نہ کہوں گا جس کا تعلق انسانیت و اخلاق سے ہو۔

باب المراسلۃ والمناظرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ از فقیر نذیر احمد ۳۵ پارک اسٹریٹ پی۔ او سرکس۔ کلکتہ۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۰ء

جناب مدیر "نگار" سلمہ اللہ تعالی

السلام علی من اتبع الہدیٰ۔ آپ کو حروف ذیل لکھنے والا ایک صوفی فقیر ہے۔

آج کل حقیقتِ وحی کے متعلق یا بالفاظ دیگر حقیقتِ مذہب کے متعلق آپ کے درمیان اور عام اسلامی عقیدہ کے درمیان ایک استدلالی وشرعی رسہ کشی شروع ہے۔ بعض تحریرات فقیر کی نظر سے بھی گزریں، جسکے باعث فقیر آپ کو مخاطب کر رہا ہے۔

برادرم! عالم دو ہیں، عالم انفس اور عالم آفاق، یا عالم امر اور عالم خلق، پھر خالق کائنات نے ان دونوں عالموں کے علوم کے حصول کے لئے انسان کے اندر دو قسم کے شعور پیدا کئے ہیں۔ نبی یا صحیح متبع نبی کے اندر یہ دونوں شعور اور ان شعوروں کے حصول کے ذرائع (حواس ظاہری وحواس باطنی) کامل درجہ پر ترقی یافتہ ہوتے ہیں اور ان میں انتہائی توافق وتعاون، کامل یک جہتی وہم آہنگی ہوتی ہے۔ لیکن نبوت یا صحیح اتباعِ نبوت کے درجہ سے نیچے۔ دونوں شعوروں کی یہ کاملیت اور پھر ان میں یہ ہم آہنگی نہیں ہوتی۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے حکمائے آفاق اور علمائے انفس کے درمیان اختلاف پیدا ہو کر بنی نوع انسان کی حقیقی وحدت ختم ہو کر بے اطمینانی وبے یقین، الحاد وسفسطہ کی ولادت ہوتی ہے۔

"الہم انی اعوذبک من الشک فی الحق بعد الیقین واعوذبک من الشیطان الرجیم"

پنج حسے ہست جز ایں پنج حس، آں چو زر سرخ ایں حسہا چو مس

نطقِ آب ونطقِ خاک و نطقِ گل، ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل

فلسفی کو منکرِ حنانہ است، از حواسِ انبیا بیگانہ است (رومی)

عالم انفس کے حقایق کو ہم اپنے انفسی شعور ہی کے ذریعہ سے معلوم کر سکتے اور عالم آفاق کے حقایق کو شعور آفاقی ہی سے دریافت کر سکتے ہیں۔ شعورِ انفسی سے اگر ہم عالم خلق یا عالم مادی کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوں، تو ہم محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح ایک خیالی چیستان سے زیادہ اور کوئی چیز نہیں پیش کر سکیں گے۔ اسی طرح اگر ہم اپنے شعور آفاقی ہی کو

عالم انفس کے حقایق کا معیار بنائیں تو سوائے اس کے کہ ہم دُنیا کے سامنے تشبیہات و استعارات کا ایک انبار لگا دیں یا سرے سے ان حقایق کا انکار کر دیں اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ اس لئے کہ جس طرح محسوساتِ بصری یا مبصرات کو حس شامہ یا ذائقہ یا سامعہ سے معلوم کرنا مشکل ہے بعینہ اسی طرح عالم آفاق کے حقایق کو شعورِ انفسی سے اور حقایق انفسی کو شعورِ آفاقی سے معلوم کرنا دشوار ہے۔ آپ کچھ عرصہ انسانی جماعت کی رنگارنگی، اختلاف، کج اندیشی اور تضاد سے اپنے حافظہ کو ہٹا کر اس مسئلہ کو محض نفسیاتی اور علمی اعتبار سے دیکھیں۔ امید ہے کہ بات صاف صاف سمجھ میں آجائے گی۔

اب یہ گزارش ہے کہ وحی، مبدا، و معاد، جزا و سزا۔ جنت و دوزخ، ملائکہ و نامۂ اعمال وغیرہ تمام حقایق، عالم انفس یا عالم امر کے حقایق ہیں، جنھیں آپ یا موجودہ دور کے بہت سے متمدن لوگ اپنے شعورِ آفاقی سے پرکھنا شروع کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جتنی چیز کا کوئی تمثیلی مفہوم سمجھ آ گیا اسے مان لیا اور جو نہ سمجھ آیا اسے حقایق آفاقی پر قیاس کر کے کچھ نہ کچھ اٹکل پچو بات کہدی۔ موجودہ دور غالباً انسانی تاریخ میں انسانی شعورِ آفاقی کی ترقی اور شعور انفسی کے زوال کے باعث انسان کی ماضی کی تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ مذہب (جس کی بنیادی سب چیزیں عالم امر سے تعلق رکھتی ہیں) اس لئے انسان سے بعید ہوتا جا رہا ہے کہ اس کے بنیادی مسایل کو سمجھنے کے لئے جس شعور کی ضرورت تھی وہ ترقی یافتہ شکل تو کیا سرے سے محلِ شبہ ہو رہا ہے۔ ہزاروں سائنٹسٹ ایسے بنیاداً منکر ہیں۔ پھر غور کریں کہ جن اشیا کا ادراک صرف اسی شعور سے متعلق ہے وہ اشیا اس شعور کی عدم موجودگی میں معلوم کیسے ہو سکتی ہیں۔

لیکن خالقِ کائنات کے دست شفقت نے انسان کی ہدایت کے راستہ کو کبھی جزاً بند نہیں کیا جب تک خود انسان اس راستہ کو اپنے اصرارِ علی الجہل اور انکارِ جامد کے باعث بند نہ کر دے۔ جسوقت انسان کا رجوع صحیح امر کی طرف ہو جائے اسی وقت وہ عشق حقیقی اس کی ہدایت (ادراکِ حقایق ماورائے مادیات) کا سامان کر دیتا ہے۔ "ان الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا"

اب یہ گزارش ہے کہ وہ اصرارِ علی الجہل جس کے بعد راہِ ہدایت بند ہو جاتی ہے یا بالفاظ واضح قبولِ ہدایت کی استعداد ہی سلب ہو جاتی ہے، اس کی نشانی یہ ہے کہ انسان اسی خیال پر قانع ہو جائے کہ حقایق کا سراغ لگانے یا ان کی کنہ تک پہونچنے کے لئے اسے جو کچھ معلوم ہے اس سے آگے اور کچھ نہیں اور پھر اسی نقصِ دید و کم سوادی کا مبلغ بن جائے۔ لیکن اگر اسکے اس کے اندر حقیقت کے سراغ لگانے کی تپش زیادہ سے زیادہ موجود ہے تو انشاء اللہ وہ حق کو پالیگا۔

ذخیرۂ وحی معہ اپنے تمام لفظی و معنوی اسلوب کے خداوندی چیز ہے۔ واقعۃً ملائکہ کی وہی حقیقت ہے جو انتہا درجے کے ایک سادہ فطرت مسلمان کے عقیدہ میں ہے۔ مگر ہے یہ چیز عالم امر کی۔ اگر عالم امر کے حقایق کو معلوم کرنے کا شعور باطنی بیدار ہو جائے تو وحی و کشف و الہام، ملائکہ کا وجود اور باقی تمام اشیا جنھیں کوئی مادہ پرست تشبیہی طرزِ بیان سے زیادہ اور کوئی وقعت نہ دے گا، بالکل محسوس و مشہود حقایق ہیں۔ رومی کے اشعار بالا کا یہی مفہوم ہے۔

اس محل پر پہونچنے کے بعد راقم آپ کو ایک بات کی دعوت دیتا ہے وہ یہ کہ اپنی نفسیاتی کیفیت کا جایزہ لیں اور دیکھیں کہ

کیا ایک مطلق مادہ پرست انسان کی حیثیت میں آپ کا دل ودماغ اس بات پر مصر اور قانع تو نہیں کہ جس حد تک علوم انبیا کی حقیقت آپ کو معلوم ہو چکی ہے اس سے آگے اور کچھ نہیں۔ اگر یہ حالت (خدا نکردہ) ہو تو فقیر کچھ نہیں عرض کر سکیگا اور اگر ایسی حالت ہو کہ مزید تحقیق وتجسس حق کی تڑپ ہو تو فقیر کا یقین ہے کہ تین چار ہفتہ کے لئے راقم فقیر کے ساتھ رہنے سے آپ کا شعور انفسی بیدار ہو سکتا ہے، جس کے بعد نہ صرف یہ کہ آپ۔ کہ لئے حقایقِ انفسی مشہود ہو جائیں گے، بلکہ امید ہے کہ آپ ایک قومی مبلغ دین بھی بن جائیں گے۔ اس لئے کہ جو شخص سراغِ حقیقت لگانے میں جتنا ہی زاید بھٹکا ہوا ہو، وہ حق پر پہونچ جانے کے بعد اتنا ہی بڑا حکیم وطبیب روحانی بھی ہو جاتا ہے۔ یہی صحیح مبلغ دین کے معنے ہیں۔

یہ حروف فقیر آپ کو اس لئے بھی لکھ رہا ہے کہ آپ میں سائنٹسٹوں کی مادی سطحیت کے بجائے ایک ادبی عمق ہے اور ایک ادیب (بشرطیکہ اس کے اخلاق کا توازن نہ بگڑ گیا ہو) کی لغزش، وہ لغزشِ مستانہ ہے کہ جو بعض وقت عرفان کا پیشِ خیمہ ہوتی ہے تخیل کی وادی کے ساتھ ہی ذرا آگے قوتِ وہمیہ کی وادی ہے اور وہمیہ کی وادی سے کشف والہام کی وادی ہے حدود مل رہے ہیں اور پھر الہام کی سرحد کے ساتھ آگے وحی ونبوت کا عالم حقیقت شروع ہوا ہے، یہاں پہونچ کر ہر چیز اپنی اصلی قدر وقیمت اور حقیقی رنگ روپ میں دکھائی اور سنائی دیتی ہے یہاں دو ہمیشہ دو معلوم ہوتے ہیں اور چار ہمیشہ چار دکھائی دیتے ہیں، یہی وہ وادی ہے جہاں کے در ودیوار "مازاغ البصر وما طغیٰ" کی حق نا وحق اعلان قلعی سے چمک رہے ہیں۔ تخیل کی وادی میں بیٹھکر اس قلعۂ طور کے بلندی کی کیفیت کا اندازہ لگانے اس سے بالکل کچھ بھی زاید نہیں کہ جتنا ایک ذہین حافظ شیرازی کی کسی عمدہ غزل کے لطف معنوی کا اندازہ لگائے۔ مگر جو لوگ ان حقایق کے ادراک ومشاہدۂ صریح کا خالق مشفق سے مطالبہ کرتے ہیں، انھیں ان کے ظرفِ ادراک کی آخری وسعت تک اس ادراک سے بھر دیا جاتا ہے۔

"ان الذین جاہدوا فینا لنہدینہم سبلنا"۔۔۔ ؏ "صحرائے عشق تنگی چشم عدو نبود"۔۔۔ مناسب سمجھیں تو ان سطور کو (جو بالکل قلم برداشتہ لکھدی گئی ہیں) اپنے رسالہ میں شایع کر دیں۔ آپ کو غالباً بیدل دہلوی کے تخیل سے بہت مناسبت بھی ہے۔ فقیر کو ایک غزل کے کچھ اشعار یاد پڑ رہے ہیں، جو بیدل کے کسی شعر سے متاثر ہو کر لکھے تھے وہ بھی تحریر کئے جاتے ہیں:

"سراغِ حقیقت"

بحریمِ خویش رساندت ز درِ مجاز سراب زا — چمنِ رخش بنمایدت ز شمیم کاکلِ تاب زا
چہ بہ شعلہ زار انا لوجود وفورِ جذب دلت کشد — اثرِ مزید طلب مکن ز فسونِ نرگس خواب زا
ز تنک فشانیِ چشم خود نہ کنی تو شکوہ تو ز قطرہ گر — شدہ غوطہ زن بہ ضمیرِ تو یم بیکرانِ حباب زا
نظرے بجوہرِ ہست وبودِ بہارِ ملکِ فنا فگن — بہ شکن خمارِ ہوس طرازیِ عمرِ شیب وشباب زا
ہمہ رنج وتاب وتب والم، ثمرِ مشاغلِ ناسزا — نہ کنی تو نسبتِ شور وشر سوئے سازِ خیر وثواب زا

بہ سکوت و عجز و کشادہ رو قدمے بجادۂ دل بنہ — ز رضائے حق کشدت بروں غونا لہائے رباب زا

ز حضور محفلِ جان جاں شدہ مانعت اثرِ خرد[1] — حذراز حواس فسوں عمل حذراز دماغِ کتاب زا

ز تموزِ برقِ جمال او شدہ خار و برگ زبانہ زن — نگۂ تو گشتہ نقاب تو ہوسِ تو گشتہ حجاب زا

دم عشوہ ریزیٔ علم و فن اسم فتنہ کاریٔ انجمن — ہمہ بر دراز دلِ مردو زن سرِ شوقِ حسن آب زا

(نگار) آپ نے جس محبت و خلوص کے ساتھ مجھے مخاطب فرمایا ہے، اس کا شکریہ، لیکن جس وقت یہ غور کرتا ہوں کہ آپ نے کیا فرمایا اور میں نے کیا سمجھا تو غالب کا یہ شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے:

حضرتِ ناصح گر آئیں، دیدہ و دل فرشِ راہ — کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

آپ فرماتے ہیں "عالم دو ہیں، عالم انفس اور عالم آفاق یا عالم آمر یا عالم خلق" لیکن گستاخی معاف، کیا میں پوچھ سکتا ہوں، کہ آپ نے یہ دو تقسیمیں کس تحقیق کی بنا پر کی ہیں، اور کیا آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ ہر شخص کو اسے سمجھ جانا چاہئے اور کیا میں اسے تعریف المجہول، بالمجہول نہیں کہہ سکتا۔

عالمِ آمر سے آپ کی کیا مراد ہے، ارسطو کا عالم مثال تو یقیناً مراد نہیں، پھر کیا ہے؟ اس کو میں خود سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے اس کا صرف ایک مفہوم نظر آتا ہے جسے میں "عالم غیب" سے تعبیر کر سکتا ہوں۔

میں "عالم غیب" کا یقیناً قایل ہوں، لیکن اس کو "عالم خلق" سے جدا نہیں سمجھتا۔ شاید یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آسکے، اس لئے میں ذرا تفصیل سے کام لوں گا۔

"نوامیس فطرت" سے تو غالباً آپ کو انکار نہ ہوگا، اور "مقادیر قدرت" کے بھی آپ قایل ہوں گے یعنی خدا نے ہست و بود کے لئے ایک قانون مقرر کر دیا ہے اور تمام مظاہر و آثار اسی قانون کے تحت وجود میں آتے ہیں، ہر چند انسان ان تمام قوانین یا قوا رکامنہ کو ابھی تک نہیں سمجھ سکا ہے جو عالم آفرینش یا عالم خلق میں مخلوقات کو "عالم ظہور یا بروز" میں لاتے ہیں۔ لیکن قدرت نے انسان کو اتنی فہم ضرور عطا کی ہے کہ وہ ان کو سمجھ سکے، چنانچہ موجودہ عہد کی علمی و فنی ترقیاں اسی انسانی کوشش کا نتیجہ ہیں۔

فطرت کے انھیں "قوا رکامنہ"، انھیں "قوانین مخفیہ" اور کائنات میں قدرت کے تمام اُس نظام ہست و بود کو جو بظاہر حواس ظاہری کی دسترس سے دور معلوم ہوتے ہیں، میں "عالم غیب" کہتا ہوں، لیکن چونکہ انسان اپنی

---

[1] شعور آفاقی مراد ہے۔ جس کی انتہائی مصروفیت شعور النفسی کی نشو و نما کو روک دیتی ہے۔ جس کا علاج وہ ہے جسے شریعت کی زبان میں تزکیہ کہتے ہیں اور جس کی دعوت آپ کو بلکہ آپ کے نقطۂ نظر کے باقی لوگوں کو بھی دیجاتی ہے۔ والسلام۔

عقل سے کام لیکر اُس عالم کی باتیں معلوم کر سکتا ہے، اس لئے میں "عالم غیب" کو "عالم خلق" سے علٰحدہ نہیں سمجھتا۔ اسوقت طبیعیات، حیاتیات، علم الکیمیا، فلکیات، طبقات الارض، علم الجو اور جرثومیات وغیرہ سب "عالم غیب" سے متعلق ہیں، جس کے بہت سے پوشیدہ حالات انسان کے علم میں آچکے ہیں اور اس علم کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

لیکن اگر عالمِ امر سے مراد آپ کی علم الٰہی سے ہے، تو بھی اسے آپ عالم خلق سے علٰحدہ نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ اشیاء جو ظاہر ہو چکی ہیں اُن کے متعلق بھی علم الٰہی کا پتہ اسی وقت چلا ہے جب وہ پیدا ہوگئیں، لیکن جو ابھی تک حالتِ عدم میں ہیں، ان کی بابت ہمیں یا کسی کو "علم الٰہی" کا حال کیا معلوم ہو سکتا ہے۔

اب آپ بتائیے کہ اگر دوزخ، جنت، ملائکہ وغیرہ جن کو آپ "عالم امر" سے متعلق بتاتے ہیں، وجود میں آچکے ہیں تو ان کا تعلق "عالم خلق" سے ہو گیا اور اگر وجود میں نہیں آئے تو پھر کسی کو ان پر داستاں زنی کا کیا حق حاصل ہے، اور کسی قسم کا کوئی شعور معدوم چیز تک نہیں پہونچ سکتا۔ میں یہاں بتا دینا چاہتا ہوں کہ ایک چیز کا نگاہ سے پوشیدہ ہونا اور اس کا معدوم ہونا ان دونوں میں بہت فرق ہے۔

آپ کا یہ فرمانا کہ انبیاء یا اولیاء خاص قسم کی باطنی حس کے مالک ہوتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے انھیں عالم امر یا علم الٰہی کا حال معلوم ہو جاتا ہے، صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل سوائے اعتقاد کے آپ کے پاس نہیں۔ میں اگر اس سے انکار کر دوں تو آپ کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔

آپ نے خود ہی فرض کر لیا کہ عالم دو ہیں اور خود ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ آپ عالم امر کو سمجھ سکتے ہیں اور میں نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا تعلق یکسر اصطلاحاتِ تصوف سے ہے اور تصوف کا اصطلاحی پہلو سوائے مفروضات و مزعومات کے کچھ نہیں۔

دیدۂ باطن، معرفت، حقیقت، عالم انفس، عالم اخلاق وغیرہ یہ تمام اصطلاحیں دوسروں کو مرعوب کرنے کے لئے وضع کر لی گئی ہیں اور ان کی بنیاد یکسر جہل مرکب پر قایم ہے۔

میں تصوف کا قایل ہوں، لیکن وہ تصوف جو انسانیت و بلندی اخلاق کا درس دیتا ہے، جو دنیا سے رنگ و نسل اور مذہب و ملت کا امتیاز مٹاتا ہے، لیکن متصوفین جہل پرست کا اصطلاحی تصوف سوائے اس کے کہ مکر و فریب سے روٹی کمائی جائے، آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔

آپ نے مجھے دعوت دی ہے کہ تین چار ہفتے آپ کے پاس قیام کر کے تعلیم باطن حاصل کر لوں۔ اس لطف و عنایت کا شکریہ، لیکن ڈرتا ہوں کہ اگر اس تعلیم کے بعد میں بھی آپ ہی جیسا ہو گیا تو کیا کروں گا۔ معاف فرمائیے میں خودکشی کر کے جان تو دے سکتا ہوں، لیکن اپنی عقل کی قربانی کے لئے کبھی طیار نہیں ہو سکتا۔ ہر چند میں جانتا ہوں کہ جہاں تک صرف جینے کا تعلق ہے، احمق زیادہ بیفکر زندگی بسر کر لیجاتے ہیں، لیکن کیا کروں، اپنی طبیعت سے

مجبور ہوں اور فردوس کے عوض بھی اپنی عقل کا سودا کرنے کے لئے طیار نہیں ہو سکتا۔

میں یقیناً بیدلؔ کے کلام سے بہت متاثر ہوں اور اس کے فلسفہ کو بہت پسند کرتا ہوں، لیکن میرا نقطۂ نظر اس باب میں آپ سے مختلف ہے۔ میں اس کے کلام میں وہ چیز پاتا ہوں جو "انکارِ خدا" سے خدا کو پیدا کرتی ہے اور آپ اس میں وہ "اقرارِ خدا" پاتے ہیں جو خدا اور اس کی خدائی دونوں سے منکر بنا دینے والا ہے۔

وشتان مابین خلل وخمر

آپ کی غزل بھی پڑھی - سبحان اللہ، کیا کہنا

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے!

ایک ضروری اعلان

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء کے نگار کی ضخامت اتنی بڑھتی جاتی ہے کہ اب فروری سنہ ۱۹۴۱ء کا نگار بھی اسی کے ساتھ شامل کر دینا ضروری ہو گیا ہے۔ یعنی جنوری کے رسالہ کے بعد فروری کا پرچہ شایع نہ ہوگا بلکہ مارچ کا شایع ہوگا۔

وہ حضرات، جن کا چندہ جنوری میں ختم ہو جاتا ہے، ان کو بھی اپنا چندہ دسمبر میں بھیج دینا چاہئے، ورنہ جنوری کا پرچہ ان کے نام بھی ذریعہ وی۔ پی بھیجا جائے گا۔

لیکن جو اصحاب جنوری کے بعد سے خریدار رہنا نہ چاہیں وہ براہ کرم مطلع فرما دیں، تاکہ جنوری کا پرچہ ان کے پاس نہ بھیجا جائے اور بجائے اس کے ایک روپیہ ان کو واپس کر دیا جائے۔

"منیجر نگار"

باب الاستفسار

کلامِ مومن

(جناب محمد یحییٰ صاحب۔ بھاگل پور)

میں مئی سنہ ۴۰ء کے نگار کے سلسلہ میں مومن کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ براہِ کرم ان کی شرح بھی تحریر فرمائیے:

۱۔ تاثیرِ سوزِ دل کرۂ نار ہے، مگر　　　اس شعلہ رو کو سینہ سے میرے لگا دیا

اگر وہ شعلہ رو سینہ سے لگ گیا تو اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ سوزِ دل کرۂ نار ہے۔

۲۔ کیا شاد شاد ہوں کہ وہ ہے تلخ کام تر　　　میری جو شورشوں نے عدو کو مزہ دیا

مومن کی شورشوں سے عدو کو مزہ ملنا اور پھر مومن کا اس پر شاد ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

۳۔ دیکھا نہ میرے نالۂ آہن گداز نے　　　آئینہ دیکھنے کا تماشہ دکھا دیا

یہ شعر بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔ نالۂ آہن گداز نے کس کو نہ دیکھا اور اس سے آئینہ دیکھنے کو کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

۴۔ رشکِ فغاں کی ہائے رقیب آفرینیاں　　　محشر نے خفتگانِ زمیں کو جگا دیا،

اگر رقیب سے مراد خفتگانِ زمیں ہیں تو کیوں اور اُن کے جاگنے کا کیا سبب؟

۵۔ غش ہیں کہ بے دماغ ہیں گل پیرہن غلط　　　ازبس دماغِ عطرِ گریباں نہیں رہا

کون غش ہے اور بے دماغ کون ہے۔ گل پیرہن غلط سے کیا مراد ہے۔

۶۔ ناکامیوں کا گاہ گلہ، گاہ شکر ہے　　　شوقِ وصال و اندہِ ہجراں نہیں رہا

پہلے مصرعہ کا دوسرے سے کیا تعلق ہے۔

۷۔ بے تودہ تودہ خاک سبکدوش ہو گئے　　　سر پر جنونِ عشق کا احساں نہیں رہا

پہلے مصرعہ کا پہلا حصہ کیا معنی رکھتا ہے۔

۸۔ آسیبِ چشمِ قہرِ پری طلعتاں نہیں　　　اے انس اک نظر کہ میں انساں نہیں رہا

پہلے اور دوسرے مصرعہ میں باہم کیا ربط ہے ؟

۹- بے سیرِ دشت و بادیہ لگنے لگا ہے جی اور اس خراب گھر میں کہ ویراں نہیں رہا

۱۰- کیا رم نہ کروگے اگر ابرام نہ ہوگا، الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا

ابرام سے کیا مراد ہے اور دوسرے مصرعہ کا کیا مطلب ہے۔

۱۱- بیٹھا رہوں کیا منتظرِ دور ہیں ساقی اتنوں میں کوئی میکدہ آشام نہ ہوگا

۱۲- خو ہوگئی ہجراں میں تڑپنے کی شبِ وصل گو چین ہو دل کو مجھے آرام نہ ہوگا،

شبِ وصل تڑپنے کی خو ہوگئی تو پھر لفظ ہجراں کا کیا مفہوم ہے۔

۱۳- کم ظرفی اغیار پہ ساقی کو نظر ہے افسوس مے آلودہ لبِ جام نہ ہوگا

۱۴- کیا فتنۂ محشر کو قدِ یار سے نسبت، ہے خاص کشی ولولۂ عام نہ ہوگا

دوسرا مصرعہ بالکل مبہم ہے۔ بے خاص کشی سے کیا مراد ہے اور ولولۂ عام سے اس کا کیا تعلق ؟

۱۵- اغیار سے بے فایدہ ہے گرمیِ صحبت کاہے کو جلے گا جو کوئی خام نہ ہوگا

کیا مومن اغیار کو عشق میں پختہ سمجھتا ہے جو کہتا ہے کہ وہ کاہے کو جلیں گے۔

۱۶- العطش زن سپہر و یار و عدو ہے ابجد خوں مرا سبیل ہوا،

۱۷- غصہ بیگانہ وار ہونا تھا بس کبھی تجھ سے یار ہونا تھا

۱۸- ہرزہ گردی سے ہم ذلیل ہوئے چرخ کا اعتبار ہونا تھا،

۱۹- کوئے دشمن میں جا پکڑتا کیوں کیا مجھے شرمسار ہونا تھا

کون کس کو پکڑتا اور اس کا دوسرے مصرعہ سے کیا تعلق ہے۔

۲۰- نہ گیا تیر نالہ سوئے رقیب مرغِ عرشی شکار ہونا تھا

"مرغِ عرشی شکار" کی ترکیب کیا ہے

۲۱- امتحاں کیجئے مرا جب تک شوق زور آزما نہیں ہوتا

۲۲- نارسائی سے دم رکے تو رکے پِھر کسی سے خفا نہیں ہوتا

۲۳- کیا ہوا ہو اگر وہ بعدِ امتحاں اپنا بیگانہ سزا پائے اب وہ دل کہاں اپنا

۲۴- صبر بعد آسایش اس تعلق پہ مشکل تھا عیش جاوداں نکلا رنج جاوداں اپنا

۲۵- عشقِ بت میں اب تو در خورِ پرستش ہیں نام ہوگیا اتنا گم کیا نشاں اپنا

(نگار) ا- کہتے ہیں کہ ہر چیز حیزِ اصلی کی طرف مایل ہوتی ہے، اس لئے آگ بھی اپنے حیزِ اصلی یعنی کرۂ نار کی طرف

مایل ہے۔ اس کو سامنے رکھئے تو شعر کا مطلب واضح ہو جائے گا۔ یعنی اگر میرے سوزِ دل کی تاثیر نے اس شعلہ رو کو مجھ سے ملا دیا تو اس کا سبب یہ ہے کہ میرا سوزِ دل کرۂ نار ہے اور اس شعلہ رو کو اصولاً اس طرف مایل ہونا چاہئے تھا۔ اس شعر کے تمام معنوں کی بنیاد صرف لفظ شعلہ رو پر قایم ہے۔

۲۔ میری شورشوں اور بے تابیوں سے دشمن نے لطف اُٹھانا چاہا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مجھ سے زیادہ تلخکام ہوا اور یہ بات میرے لئے بڑی خوشی کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ لطف اُٹھانے سے مراد یہ ہو کہ اس نے محبوب پر اپنی محبت کا اظہار کیا ہو اور محبوب نے اسے بھی تکلیف پہونچائی ہو۔ اب رہا زیادہ تلخکامی کا سوال، سو ہوسکتا ہے کہ اشارہ اس طرف ہو کہ چونکہ عدو نے فی الواقع محبت بھی نہ کی تھی اس لئے یہ تلخکامی اور زیادہ ناگوار ہوئی۔

۳۔ آپ اس شعر کو یوں پڑھئے:

دیکھا نا؟ میرے نالۂ آہن گداز نے آئینہ دیکھنے کا تماشہ دکھا دیا

اب غالباً آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔ پہلے لوہے کو صیقل کرکے آئینہ بناتے تھے اس لئے مومن کے نالۂ آہن گداز نے محبوب کے آئینہ کو پگھلا دیا۔

۴۔ محشر نے میری فغاں پر رشک کرکے اتنا ہنگامہ بپا کیا کہ خفتگانِ زمین جاگ اُٹھے اور وہ سب محبوب کو دیکھ کر فریفتہ ہوگئے۔ گویا محشر کا میری فغاں پر رشک کرنا میرے حق میں رقیب پیدا کرنے والا ثابت ہوا۔

۵۔ غش ہیں یعنی ہم خوش ہیں کہ گل پیرہن والوں (معشوقوں) کی طرح ہم بھی بے نیاز ہوگئے اور اس طرح کسی کے عطرِ گریباں سونگھنے کی بھی پرواہ نہیں رہی۔ مدعا یہ کہ اب ہم بھی معشوقوں کی طرف سے بے پرواہ ہوگئے ہیں۔

۶۔ ہماری ناکامیاں اس حد تک پہونچ گئیں کہ نہ شوقِ وصال باقی رہا نہ غمِ ہجراں۔ اور اب ہماری حالت یہ ہے کہ کبھی تو ہم شوقِ وصال باقی نہ رہنے پر اپنی ناکامیوں کی شکایت کرتے ہیں اور کبھی غمِ ہجراں نہ رہنے پر ان کا شکریہ۔

۷۔ جنونِ عشق نہ رہا تو خاک اُڑانا بھی گیا۔ "تودہ تودہ" خاک کی کثرت کو ظاہر کرتا ہے۔

۸۔ معشوقوں کی چشمِ مہر کا ڈر یا خلل مجھے نہیں رہا تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ انسان نہیں رہا، اس لئے اے اُنس اے محبت پھر اک نظر کر کہ میں پھر انسان بن جاؤں۔

۹۔ مومن اُس گھر کو جو آباد ہے، خراب کہتا ہے اور پھر تعجب کرتا ہے کہ اسی گھر میں اس کا جی لگنے لگا ہے۔

۱۰۔ محبوب نے مومن پر یہ الزام قایم کیا کہ تم بالکل پیچھے پڑ گئے ہو اور میں اسی بات سے بھاگتا ہوں۔ اس کے جواب میں مومن کہتا ہے کہ کیا اگر میری طرف سے ابرام (اصرار) نہ ہوگا تو کیا تم مجھ سے نہ بھاگوگے، یعنی یقیناً بھاگوگے اور پھر الزام تمھیں پر عاید ہوگا۔

۱۱- اے ساقی کیا میں اس انتظار میں بیٹھا رہوں کہ دورِ شراب مجھ تک آئے تو شراب پیوں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اتنے مجمع میں کوئی ایک بھی ایسا نہ ہوگا جو میخانہ کا میخانہ ختم کردے اور شراب مجھ تک پہونچ ہی نہ سکے۔

۱۲- اس شعر میں "شبِ وصل" کا تعلق دوسرے مصرعہ سے ہے۔ یعنی مجھے تو ہجر میں تڑپنے کی عادت ہوگئی ہے اس لئے اگر شبِ وصل دل کو چین ملا بھی تو مجھے لطف نہ آئے گا۔

۱۳- لبِ جام کا مے آلودہ ہونا یعنی اسے شراب سے لبریز کردینا۔ مطلب یہ ہے کہ ساقی اغیار کی کم ظرفی کو دیکھ رہا ہے اس لئے شاید وہ لبریز جام کسی کو نہ دے گا اور ہم بھی کم ظرفیِ اغیار کی وجہ سے اس نعمت سے محروم رہیں گے۔

۱۴- "خاص کُشی" یعنی چُن چُن کر ہلاک کرنا۔ مطلب یہ ہوا کہ قدِ یار تو خاص خاص آدمیوں کو دیکھ کر ہلاک کرتا ہے اس لئے لوگوں میں ولولہ پیدا ہو جاتا ہے، لیکن فتنۂ محشر میں تو سبھی ہلاک ہو جائیں گے اس لئے ولولہ کس میں پیدا ہوگا؟

۱۵- اگر تم اغیار سے گرمیِ صحبت اس لئے رکھتے ہو کہ مجھے جلاؤ تو یہ خیال فضول ہے کیونکہ میں خام تو ہوں نہیں جو جلوں جلنے کا تعلق اغیار سے نہیں بلکہ خود مومن سے ہے۔

۱۶- میرا خون بیکار سبیلِ عام ہوا، کیونکہ آسمان، رقیب اور محبوب کی پیاس اب بھی نہیں بجھی اور بدستور میرے خون کے پیاسے ہیں۔

۱۷- پہلے مصرعہ کو استفہام کے انداز سے پڑھئے۔ یعنی کیا تم کو بیگانہ وار مجھ پر غصہ کرنا چاہئے تھا۔

۱۸- ہم اور چرخ دونوں ہی ہرزہ گرد ہیں۔ لیکن میں اپنی ہرزہ گردی کی وجہ سے اتنا ذلیل ہوا کہ آسمان کی ہرزہ گردی کو بھی لوگ بھول گئے اور میرے مقابلہ میں اس کا اعتبار بڑھ گیا۔

۱۹- جا پکڑنا، پکڑ لینے کے معنے میں نہیں ہے۔ بلکہ جا بہ معنی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی دشمن کے کوچہ میں، میں کیوں جگہ اختیار کرتا

۲۰- "مرغِ عرشی" سے مراد فرشتے ہیں۔ یعنی میرے تیرِ نالہ سے فرشتے تو زخمی ہوگئے لیکن رقیب ان کا شکار نہ بن سکا۔

۲۱- جب تک میرے شوق نے زور آزمائی نہیں کی، امتحان کئے جائے، لیکن جس دن یہ ہوا تو پھر امتحان ختم ہو جائیگا اور آپ خود کھنچکر میرے پاس پہونچ جائیں گے۔

۲۲- خفا میں ایہام ہے، یعنی خفا ہونا برہم ہونے کے معنی میں بھی ہے، اور دم رکنے کو بھی "دم خفا ہونا" کہتے ہیں۔ اور اسی ایہام پر شعر کی بنیاد قایم ہے۔

۲۳- اگر محبوب امتحان کے بعد اپنا ہوا بھی تو کیا، کیونکہ اب ہم میں امتحان یعنی بیگناہ سزا پانے کی تاب ہی باقی نہیں۔

۲۴- اگر راحت کے بعد تکلیف ہوتی تو صبر مشکل تھا، اس رنج ہارا رنج جاوداں، فی الحقیقت عیش جاوداں ہے کہ ہمیں راحت کے بعد تکلیف کا سامنا کرنا ہی پڑا۔

۲۵- ہم نے عشقِ بُت میں اپنا نام و نشان اتنا گُم کردیا کہ نام ہوگیا اور اب خود خدا کی طرح (جو خود بھی بے نام و نشان ہے) ہماری پرستش ہونے لگی۔

نانا میاں کی موٹریا

رات میں دو بجے میں جو پانی پینے کے لئے اُٹھا تو دیکھا کہ ہمارے داروغہ جی روشنی جلائے بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا "داروغہ جی کس فکر میں ہو؟" کہنے لگے "میاں کھٹملوں نے سارا خون چوس لیا۔ انتظار میں ہوں کہ وہ دکھائی دیں تو میں بھی اپنا دستِ شفقت پھیروں" اس کے بعد کہنے لگے "تمہارے نانا میاں کے زمانہ میں بھی ایک مرتبہ اسی طرح اُٹھا تھا ان کو جب معلوم ہوا کہ گھر میں کھٹمل ہو گئے ہیں تو انھوں نے راتوں رات گھر کو آگ لگوا دی۔ اللہ بخشے بڑے مزے کے آدمی تھے۔ میاں دنیا تو ایک سگریٹ"۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے کہنے لگے "اِدھر گرمیاں آئیں اور انھوں نے ولایت سے سگریٹوں کا ایک ویگن منگوایا۔ دو چار بیڑیاں سگریٹ ہم بھی اُڑا دیتے تھے۔ اگر گرمیوں کے گزرنے سے پہلے سگریٹ ختم نہ ہوئے تو بچے ہوئے سگریٹ لاٹ صاحب کی کوٹھی بھیج دئے اور برسات کے موسم والے سگریٹوں کا ویگن منگوا لیا" مجھے سوتا ہوا محسوس کر کے داروغہ جی کہنے لگے "ارے میاں تم سو رہے ہو؟" میں نے زرا دبی ہوئی آواز میں کہا "نہیں جاگ رہا ہوں"

"ہاں سو نامت آج میں تم کو تمہاری چھوٹی نانی کا قصہ سنانے والا ہوں"

"چھوٹی نانی کون؟"

"تم ہوں ہوں کیے جاؤ میں ساری باتیں بتاتا ہوں" حلق سے ایک گولی اُتارتے ہوئے پھر اپنی بکواس شروع کی "تمہارے نانا۔ خدا ان کو جنت میں جگہ دے ۔ بڑے بھولے بھالے حاتم صفت اور نیک انسان تھے۔ قسم ہے وحدہٗ لاشریک کی اس نے نانا میاں جیسے لوگ اب تک دو چار ہی پیدا کیے ہوں گے۔ ان کے پاس ایک موٹریا تھی"

"موٹریا کیسی؟"

"یہی چھوٹی موٹر۔ میاں کیا تعریف کروں اُس کی۔ جب کبھی اس کا خیال کرتا ہوں تو بس اسکی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے خاص طور پر ولایت سے بنوا کر منگوائی تھی۔ تین چار ہزار روپیہ ماہانہ تو فقط تیل پر خرچ ہو جاتا تھا"

"تین چار ہزار روپیہ اور چھوٹی سی موٹر کا خرچ!! کیا چوبیس گھنٹے پھرا کرتے تھے؟"

"نہیں جی ہفتہ میں مشکل سے دو ایک مرتبہ بیٹھتے ہوں گے"

"تو پھر اتنا روپیہ کیسے خرچ ہوتا تھا کیا پٹرول مہنگا تھا؟"

"ارے وہ پٹرول" سے کب چلتی تھی۔ پٹرول کی ٹنکی میں "پیرس" کا سینٹ اور تیل کی ٹنکی میں اصغر علی محمد علی کے کارخانہ کا نہایت اعلیٰ ملوان عطر پڑتا تھا"

"داروغہ جی تم یہ کیا کہہ رہے ہو"

"ارے میاں واللہ جھوٹ نہیں بالکل واقعہ ہے"

"تعجب ہے"

"اجی ابھی اور سنو۔ اس کے ٹائر جو ہوتے تھے نا، وہ گاڑھے میدے کے ہوتے تھے۔ میدہ کے ٹائروں میں کھوے کے ٹیوب اور ان میں جنگلی گلاب میں بسی ہوئی ہوا بھری جاتی۔ جو کبھی اس میں "پم چر" ہو جاتا تو سارے شہر میں خوشبو پھیل جاتی اور لوگ سمجھ جاتے کہ تمہارے نانا میاں کی موٹریا کا پہیہ بیٹھ گیا ہے۔

"داروغہ جی تم کچھ مذاق کر رہے ہو"

"تمھیں تو ہر بات مذاق ہی معلوم ہوتی ہے۔ اچھا جانتے ہو اُسکی گدیاں کاہے کی تھیں؟ صابن کا جو کف ہوتا ہے نا اس کو چاندنی میں سُکھا کر گدیاں بنائی تھیں اور ان پر ولایت کے پھول ٹانک دئے تھے۔ واللہ ہے، میاں پھول بھی عجیب قسم کے تھے۔ قریب جاؤ اور بیٹھنے لگو تو خود بخود سکڑ کر دب جاتے اور دور ہو جاؤ تو ایسا معلوم ہو کہ ایک ایک گدی ایک ایک گلدستہ ہے۔ اچھا اسکے چلانے کی کنجی بھی خاص وضع کی تھی۔ کنجی لگانے پر وہ اُس وقت تک چالو نہ ہوتی جب تک نانا میاں انگریزی میں اس سے کچھ گٹ پٹ نہ کر لیتے۔ ہماری سمجھ میں تو خاک بھی نہ آتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ موٹر جب چالو ہو جاتی تو کہتے "چل ری موٹر بسم اللہ اب" اور اس کے بعد وہ آگے بڑھنے لگتی"

انھوں نے دوسری گولی حلق سے اُتاری اور میں نے کہا "داروغہ جی تم اب آسمان پر پہونچ گئے ہو مجھے بھی سونے دو اور خود بھی لیٹ رہو"

"بڑے میاں تمھارے نانا میری عزت کرتے تھے تم میری گودی کے کھلائے ہوئے ہو مجھ سے ایسی باتیں کرتے ہو"

"نہیں داروغہ جی، میرا مطلب یہ ہے کہ رات بہت ہو گئی ہے، تم کو بھی نیند آ رہی ہوگی بس اب سو جاؤ"

"نہیں میں نہیں سوؤں گا۔ ایک مرتبہ اسی طرح رات میں سونے پر تمہارے نانا میاں سے جھگڑا ہو گیا۔ انھوں نے جب اپنی ہار مان لی تو اُسی وقت سارے شہر میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ آج کی رات اٹھارہ گھنٹے کی ہوگی نانا میاں شہر کے کوتوال تھے حکم چلتا تھا رات اٹھارہ گھنٹے کی ہو کر رہی۔ ہاں تو میاں میں تم کو اُس موٹریا کا حال سنا رہا تھا۔ اس کی رفتار کا کیا کہنا۔ چاہو تو جوں کی طرح رینگے اور اگر چاہو تو بندوق کی گولی سے بڑھ جائے ایک دن اُن میں اور لاٹ صاحب میں اسی پر شرط بندھی۔ قسم ہے گولی اور موٹر میں بس اُنیس بیس کا فرق رہا ہوگا"

"داروغہ جی اُس میں روشنی کیسی ہوتی تھی؟"

"روشنی کہاں ہوتی تھی۔ اندھیرا ہی اندھیرا رہتا مگر میاں اندھیرا بھی ایسا ولایتی کہ سوئی میں تاگہ پرو لو"

"اچھا اس کا ہارن کیسا تھا؟"

"ہارن کیا ہوتا ہے؟"

"اجی وہ ہوتا ہے نا، پوں پوں کرتا ہے"

"اچھا وہ پنگا؟"

"ہاں، ہاں پنکھا"

"ارے وہ تو سب سے عجیب وغریب چیز تھی۔ اس کا راز تو تمھارے، نانا میاں کو بھی معلوم نہ تھا۔ چوک سے گزر جاتے تو جانوروں کی بولیاں شروع ہو جاتیں، باغوں میں جاتے تو پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دیتی اور اگر کسی اصطبل میں جانا ہوتا تو معلوم ہوتا گھوڑے ہنہنا رہے ہیں ـــــ موٹر جب گھر کے قریب پہونچ جاتی تو "سرکار آرہے ہیں" کی آواز نکلتی۔"

"داروغہ جی، نانا میاں اس موٹر کو رکھتے کہاں تھے؟"

"بس یہ نہ پوچھو"

"تمھیں میری قسم بتادو"

"تم بچہ ہو ابھی ان جھنجھٹوں میں نہ پڑو۔ یہی تو تمھاری چھوٹی نانی کا راز ہے"۔

"تمھیں نانا میاں کی ہڈیوں کی قسم بتادو"

"تم نے نانا میاں کی قسم دے کر غضب کر دیا۔ دیکھو معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے"۔

"ارے بتا بھی دو میں کسی سے کہوں گا نہیں"

"بات یہ ہے کہ تمھارے نانا میاں کو ایک فرنگن سے محبت ہو گئی تھی۔ عورت تھی چھبیلی چھبیلی میاں جی ایسے لٹو ہوئے کہ تن من دھن سب ہی وار دیا۔ یہ موٹر دراصل اُسی کی فرمائش پر ولایت سے منگوائی تھی اور اُسی کے پاس رکھا کرتے تھے۔ نانا میاں کا جب انتقال ہوا تو میں تو لگ گیا جاگیر کے دھندوں میں اور وہ فرنگن موٹر لیکر ولایت فرار ہو گئی۔ اسکے مرنے کے کوئی دس سال بعد خبر لگی کہ اُس کی نواسی اسی شہر میں رہتی ہے۔ سُنا ہے وہ بھی بڑی رنگیلی ہے ـــــ اتنی سرخ وسپید کہ گال پر اگر محبت بھرا طمانچہ لگاؤ تو خون دوڑتا ہوا دکھائی دے۔

"داروغہ جی کیا اس بڑھاپے میں تمھاری نیت ڈانواڈول ہو رہی ہے"۔

"نا میاں ان فرنگنوں سے دل نہ لگانا۔ دین و دنیا دونوں خراب، میں تو ان سے کوسوں دور بھاگتا ہوں، پتہ چلا ہے کہ اس کی ماں نے ایک خط میں لکھا تھا کہ موٹر کی رسید میرے پاس ہے اگر وہ کسی طرح اُڑا لی جائے تو ان کی پانچوں اُنگلیاں گھی میں ہوں گی۔ یہ بھی علم ہوا ہے کہ کوئی جرمن شہزادہ اس موٹر کے لئے اپنا پاؤ ملک دینے کو طیار ہے"۔

"واقعی؟"

"ہاں، ہاں اور نہیں تو کیا۔ یہ آجکل جرمن اور انگریز ایک دوسرے کو لڑائی کی جو دھمکیاں دے رہے ہیں اس کی اصل وجہ بس نانا میاں کی وہ موٹریا ہے"۔ اس کے بعد داروغہ جی کہنے لگے) میاں دینے کو میں رسید تمھیں دیدیتا مگر ڈر یہ ہے کہ کہیں اُس لونڈیا کے جال میں نہ پھنس جاؤ بابا جانی کا خون ہے اگر کہیں جوش میں آکر رسید اُسے دیدی اور یہ معاملہ

طشت ازبام ہوگیا تو قسم ہے جرمن اور انگریز ہندوستان ہی میں لڑ پڑیں گے ——— اور ہر پھر کے سارے مصیبت ہم غریب ہندوستانیوں پر آجائے گی۔"

"نہیں داروغہ جی میں تو رسید بتا کر اُسی کو پھانسنا چاہتا ہوں۔"

"ارے بابا چھوڑو اِن فرنگنوں کو۔"

"داروغہ جی معاف کرنا تم نے زمانہ تو دیکھا ہے مگر ان مورتیوں کی پوجا نہیں کی ہے۔"

"نعوذ باللہ۔ میں کیوں پوجا کرنے چلا تھا۔ خدا اس دن کے لئے زندہ نہ رکھے۔ تمھارے نانا میاں سے ملنے کے لئے بڑی بڑی ہستیاں تڑپتی تھیں اور وہ بھی اُسی طرح جان فدا کرتے تھے مگر قسم ہے میں نے تو کسی کو نظر بھر کے دیکھا تک نہیں۔ یہ میدہ کی مورتیاں جائیں چولہے میں ہمیں تو اپنی چندی کی گڑیا ہی پسند ہے۔ اُسی سے کھیلا کریں گے۔"

"اچھا تو داروغہ جی بتاؤ وہ رسید کہاں ہے ؟"

"کہہ تو دیا کہ میرے پاس ہے جب وقت آئے گا تو دے دوں گا۔"

"بڑھے ہونے کے بعد دی تو کیا فایدہ۔ اب دو"

"میاں تم رسید دکھا دو گے اور جرمن اور انگریز میں لڑائی کرادو گے"

"نہیں جی میں تو اس چھوٹی نانی کی نواسی کو پھانسوں گا۔"

"وہ اور بھی بُرا ہوگا۔"

"ارے اُسے تو لونڈی بنا کر رکھوں گا اور نانا میاں کا بدلہ لوں گا۔"

"یاد رکھو وہ تمھیں تباہ کردے گی، اُس موٹریا کے واپس ملنے کی جو رہی سہی امید ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔"

"تمھیں میری جان کی قسم دیدو" ——— "اچھا اب رات بہت ہوگئی ہے سو جاؤ، صبح باتیں کریں گے۔"

——— "پہلے وعدہ کرو کہ رسید دو گے" ——— "وعدہ بھی جب ہی کریں گے۔"

"مگر اسوقت ہاں کہدو" ——— "اچھا بھئی دیں گے مگر دیکھنا بنا بنایا کھیل نہ بگاڑنا۔"

صبح آنکھ کھلی تو سب سے پہلے داروغہ جی کو آواز دی۔ میں نے جو بار بار پکارنا شروع کیا تو شیخ محبوب خوف سے کانپنے لگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا "سرکار، داروغہ جی کو مرے ہوئے تو ایک سال ہو چکا ہے آج انکی برسی ہے۔"

——— میں نے وسکی کا خالی شیشہ اس کی طرف پھینکتے ہوئے دوسرا شیشہ لانے کا اشارہ کیا۔ اسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ تو لگا دیوار پر چسپاں کئے ہوئے پوسٹر کو دیکھنے ——— پوسٹر پر لکھا تھا "آج سے نشہ کی ممانعت ——— قانون نافذ ہوگیا"———

میں نے اپنے ہی لگائے ہوئے پوسٹر کو خود بھی ایک مرتبہ دیکھا اور اپنا سر لحاف میں چھپا لیا۔

مرزا ظفر الحسن بی۔ اے (عثمانیہ)

زلزلہ

زلزلہ اک متنِ خونیں کی ہے تفسیرِ مہیب !
انقلابوں کی زباں، آشوب و طوفاں کا نقیب

اک جنونِ بے اماں، اک اضطرابِ ناگزیر
شعلہ فطرت، زندگی کی گرم آوازِ ضمیر

زلزلہ، یعنی پسِ پردہ حوادث کا شباب
ایک خود آرا حرارت، ایک خودرَو التہاب

سینۂ گیتی کے اک مدہوش جذبے کا اُبال
فطرتِ بالغ نظر کا ایک پُرہیبت سوال

ذہنِ فطرت کی چمک، قلبِ عناصر کا گداز
سانس کے انفاس سے باہر نوائے گرم ساز

بند ہو فولاد کے سینے میں بھی شعلہ اگر
ہو ہی جاتا ہے ہویدا پیرہن کو پھونک کر

زلزلہ ہے لوحِ فطرت کی ہر اک تحریر میں
زلزلہ ہے پھول کے ہر برگ کی تعمیر میں

اہرمن بھی اک تھپیڑا ہے اسی طوفان کا
اور یزداں بھی ہے اک پرتو اسی رومان کا

ہے ازل سے روحِ بے تابی خدائے زندگی
زلزلہ ہے ابتدا و انتہائے زندگی ! !

وہ پریشانی گزیدہ دل، وہ تھکے ماندے دماغ
بجھ گیا ہے تھر تھرا کر جن کی قوت کا چراغ

جو سمجھتے ہیں گناہوں کا ثمر ہے زلزلہ
ظلمتِ کردار کا مہلک اثر ہے زلزلہ

واقعیت کو سمجھنے سے ذرا معذور ہیں
اپنے استدلال کے افلاس سے مجبور ہیں

بحر کو ہر حال میں طوفان زا رہنا ضرور
زندگی کو رقص و رم میں مبتلا رہنا ضرور

کتنے پنہاں زلزلے، کتنے نہفتہ واقعات
سطح کے نیچے تلاطم خیز صد ہا ممکنات
ق
اضطراب آگیں ہیں پردہ پھونک دینے کے لئے
عرصۂ ہستی میں آکر سانس لینے کے لئے

زلزلہ فطرت کی انگڑائی کا عرف عام ہے
زندگی خود اک دوامی زلزلے کا نام ہے

عدم

آتشِ خاموش

جذب و یقین:

تدبیر کے دامن میں ہے تقدیر کا مقصود　　کرتا ہے عمل، دہر میں ناپید کو موجود
آزاد بھی ہو جائے تو آزاد نہ ہو گا　　ہے خاکِ وطن جس کی تمناؤں کا معبود
جب تک کہ براہیم کی فطرت نہ ہو پیدا　　وجدان بھی آذر ہے، تخیل بھی ہے نمرود
توحید کا پیغام نہ ہندی نہ عراقی　　اسلام کے نقشہ میں نہ قندھار نہ جمرود
پیپل کے پجاری سے یہ امید نہیں ہے　　کر دے جو غلامی کے کسی نقش کو نابود[1]
ایمان کے سایہ میں خطائیں بھی ہیں مقبول[2]　　بے جذبِ یقیں نیکیٔ اعمال بھی مردود

غازی کے لئے ننگ ہے آرام کی روزی
شاہیں کی غذا سیب نہ انگور نہ امرود

حدیثِ حکیم:

محفل میں تری کیا نہیں فریاد کا دستور　　اتنا تو نہ کر فطرتِ آزاد کو مجبور
عرفان کی تاثیر ہے فریاد کی لے میں　　ڈر ہے کہ نہ ہو جائے حریفِ لبِ منصور
دستور تو بس ایک ہے اللہ کا قانون　　مٹی کے گھروندے ہیں بنائے ہوئے دستور
یہ دولت و افلاس کی تقسیم غلط ہے　　اسلام میں سب ایک ہیں افسر ہو کہ مزدور
اب تک ہے[3] مسلمان کے ادراک میں روشن　　وہ برق جو چمکی تھی کسی روز سرِ طور
جس قوم کو منظور نہ ہو اپنی بھلائی　　اللہ کو بھی اُس کی بھلائی نہیں منظور
کرتا ہے یہی کفر کی محفل میں اُجالا　　ایمان ہے در اصل چراغِ شبِ دیجور

ڈال انفس و آفاق پہ عرفاں کی نگاہیں
آنکھوں سے ہے وہ دور مگر دل سے نہیں دور

---

[1] حالانکہ ہو بھی رہا ہے — [2] بالکل غلط — [3] ہرگز نہیں ہے۔

سرودِ ضمیر:

ہے بدر کے میداں میں مسلمان کا مقسوم
یہ صفحۂ تاریخ پر عنوان ہے مرقوم

انجام میں در اصل یہ دونوں ہیں برابر
چیخوف کا قصہ ہو کہ موسیقیٔ کلثوم

الفاظ کی تاویل کے دھوکوں کو نہ پوچھو
تہذیب کی دُنیا میں گنہگار بھی معصوم

قوموں کی ہدایت سے نہیں اُن کو سروکار
یونان کی دانش ہو کہ ہو فلسفۂ روم

یہ بھی ہے اُسی مکر کے ناقوس کی آواز
ہٹلر کی سیاست بھی ہے تہذیب کا اقنوم

ہوتی نہیں مقبول غلاموں کی نمازیں
سمجھا ہی نہیں شیخ نے اسلام کا مفہوم

ماہر مری نظروں میں ہے اب تک وہ ملاقات
کس دل سے کہوں حضرت اقبال کو مرحوم

ماہر القادری

آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علٰحدہ علٰحدہ خرید فرمائیں تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں:

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ۲ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نو روپیہ
معرکۂ سخن	مکتوبات نیاز	اُردو شاعری	ہندی شاعری	میزان کل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	ستائیس روپیہ آٹھ آنہ

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپئے میں ملجائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے

منیجر نگار لکھنؤ

دی مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قایم کی ہوئی واحد جہازران کمپنی

خاص حج سروس

تھوڑے تھوڑے وقفے سے بمبئی و کراچی سے جدہ کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام نئی وضع کے سات جہازوں کا شاندار بیڑہ، جس میں جہازوں کا سرتاج ایس ایس "اسلامی" (وزن ۵۸۷۹ ٹن) بھی شامل ہے۔ گزشتہ موسم حج میں جبکہ جنگ کی وجہ سے جہازرانی کے مصارف بہت زیادہ بڑھ گئے تھے مغل لائن نے نہ تو حاجیوں سے زیادہ کرایہ لیا نہ حج سروس بند کی۔

بمبئی اور کراچی سے عدن - جدہ اور بحر احمر کی بندرگاہوں نیز پورٹ لوئی اور ماریشیس تک مسافر اور باربرداری کی سروسیں۔

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جاسکتی ہیں

تفصیلات کے لئے خط و کتابت کیجئے

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶ - بنک اسٹریٹ بمبئی